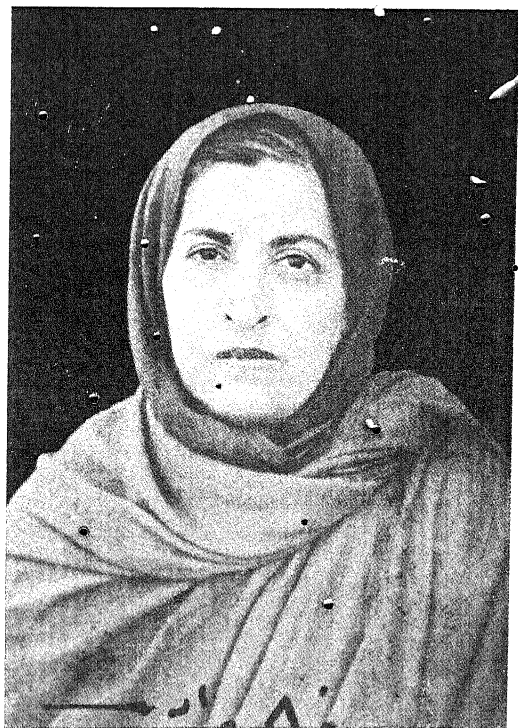


جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے توسیعی خطبات ۱۹۳۵ء

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

از

خالدہ ادیب خانم

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ ایم۔ اے ۔ پی ایچ ڈی

استاد فلسفہ و تعلیمات ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مع دیباچہ

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۔ امیر جامعہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

طبع اول ایک ہزار　　جولائی ۱۹۳۵ء　　قیمت عہ

مطبع جامعہ ملیّہ اسلامیہ، دہلی

فہرست مضامین

دیباچہ

یہ کتاب خالدہ خانم صاحبہ کے ان توسیعی لکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے گذشتہ جنوری اور فروری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دئے تھے اور جواب بہت کچھ ترمیم کے بعد شائع کئے جا رہے ہیں۔ جامعہ کے توسیعی لکچروں کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں غیر ملکوں کے ان مشاہیر سے جو اپنے ملک کے حقیقی نمائندے ہیں ملنے کا موقع ہاتھ آئے، دوسرے یہ کہ ہم اوروں کی زندگی کے مسائل اور مقاصد سے واقف ہو کر اپنے تجربے کو وسعت دے سکیں۔ خالدہ خانم کے تشریف لانے سے یہ دونوں باتیں بخوبی حاصل ہوئیں۔ خود اُن کا فضل و کمال اور ان کے معاشرتی اور اخلاقی خیالات مشرق اور مغرب کے بہترین عناصر کے امتزاج کا نمونہ ہیں اور ان لکچروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو جو ایک قدیم تہذیب کے وارث ہیں اور جو یہ معاشرت کی بنا ڈالنا چاہتے ہیں، لازم ہے کہ ترکی سے واقفیت حاصل کریں جہاں تہذیب و تمدن کے مختلف عناصر کو سمو کر ایک نئی تہذیب کی تشکیل ہو رہی ہے

میں خالدہ خانم سے پہلی بار ۱۹۱۲ء میں قسطنطنیہ میں ملا تھا وہ اُس وقت بھی یہ چاہتی

تھیں کہ ہندوستان آئیں اور ہمیں اپنے ملک کے صحیح حالات سے آگاہ کریں کیونکہ جہاں ترکی کا مقابلہ یورپ کے سامراج کے شدید حملوں اور اس کی بے باکانہ حکمت عملی کی گہری چالوں سے تھا وہاں اُسے اس زبردست تحریک سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا جو اسے بدنام کرنے کے لئے پوری تنظیم اور اہتمام کے ساتھ اُٹھائی گئی تھی مگر میرے خیال میں یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ اس زمانے میں تشریف نہیں لائیں بلکہ اب آئیں جب کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور وہ اطمینان اور فخر کے ساتھ اپنے وسیع اور گوناگوں تجربات اور اپنی قوم کے شجاعانہ کارناموں پر نظر ڈال سکتی ہیں وہ ہمارے سامنے اس طرح نہیں آئیں کہ ان کا دل شکوہ و شکایت اور غم و غصے سے لبریز ہو بلکہ اس طرح کہ ان کا دماغ انسانی امور و معاملات کے صحیح اور وسیع علم اور انسانی ہمدردی سے روشن ہے جو سنجیدگی سے سوچ غور کرنے سے اور بات کے ہر پہلو کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ان کی زندگی کے خاص خاص واقعات ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے اور ان کا یہاں ذکر کرنا محض تحصیل حاصل ہے۔ البتہ ایک چیز خاص طور پر قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ خالدہ خانم ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی میں دو انداز خیال، طرز معاشرت کے دو نصب العین ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ ایک خالص مشرقی گھرانے میں گذرا۔ ان کی تعلیم اور زمانے کے حالات نے انہیں مغرب سے آشنا کیا۔ ان کے لئے یہ آسان تھا کہ مشرق کی بہت سی تعلیم یافتہ عورتوں کی طرح اپنی تہذیب کی منکر ہو جاتیں اور عملاً نہیں تو اصولاً اپنا حق تسلیم کرالیں کہ وہ جو سمجھنا چاہیں

اختیار کر سکتی تھی۔ یہ بھی آسان تھا کہ وہ خود پسندی اور تعصب کی آڑ لے کر نئے
فرائض اور نئی ذمہ داریوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر انھوں نے ایسی زندگی
بسر کرنا پسند نہیں کیا جو معنویت سے خالی ہو اور محض ظاہری تہذیب و شائستگی کے ملمع
سے چمکتی ہو جس کی اخلاقی اور معاشرتی قوتیں ماؤف ہو چکی ہوں گی۔ قدیم رسمی تعلیموں
کا یہ [illegible] جیسا کہ ہوتا [illegible] وہ اس میدان میں کود پڑیں جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا اور جہاں
ہو کر وہ ایک طرف دانشوروں سے عرب کی بنیادی خصوصیات آزادی، تعلیم اور
معاشرتی اقدار کی اہمیت اچھی طرح سمجھ لی ہے اور دوسری طرف اپنی قوم کی
[illegible] اور [illegible] کی [illegible] نگہداشت کی وسعت ان کے دل میں ان
وسعت کی [illegible] اور [illegible] جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ [illegible]
[illegible] کثرت سے [illegible]
[illegible] محبت کا [illegible] انھوں نے [illegible]
[illegible] حیثیت سے [illegible] دوسرا [illegible]
[illegible] کی حیثیت سے [illegible] دیا گیا ہے اور
[illegible] غلط [illegible] تشبیہات کا [illegible] دیکھا ہے۔ انھوں
نے [illegible] تعالیٰ کی [illegible]
[illegible] تو انھوں نے [illegible] کے اصولوں سے
[illegible] انھوں نے [illegible] کے [illegible] سے زندگی کو

زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا بغاوت کی ہے۔ اخوت، انصاف اور حق کی خاطر بے دھڑک اشخاص اور ضوابط کی مخالفت کی ہے۔ وہ اپنی قوم کی محبت اور خدمت میں مصروف رہی ہیں مگر اس وسعت قلب کے ساتھ جو پوری نوع انسان کو محیط ہے۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ اُس جنگ میں جس پر اُس کی زندگی اور آزادی کا دارو مدار تھا دل وجان سے شریک رہی ہیں۔ مگر اس عالمگیر اخلاقی اور تمدنی کش مکش کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئیں جس میں یہ جنگ محض ایک جزوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ان سے زیادہ وثوق کے ساتھ کون ان بنیادی مسائل پر بحث کر سکتا ہے جن کے حل ہونے پر مشرق کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔

تاہم میرے خیال میں اس کتاب پر بڑی قیل وقال ہوگی اصل میں جغرافیئے کی اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ دو طرزہائے خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کوئی ایسی تعریف، جسے ہر شخص قبول کرلے ناممکن ہے اس میں شک نہیں کہ جیسا خالدہ خانم فرماتی ہیں روحانی زندگی پر حد سے زیادہ زور دینا مشرق کی اور مادی زندگی پر حد سے زیادہ زور دینا مغرب کی بنیادی خصوصیت ہے مگر دونوں کے یہاں اس کے برعکس رجحانات بھی اس حد تک پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کو اس کلئے پر اعتراض کرنے کا موقع ہے خصوصاً مشرق میں جب لوگ بحث کرنے پر آتے ہیں تو وہ علمی اور معروضی حدود سے بہت آگے بڑھ جایا کرتے ہیں۔ کوئی مشرق کی حقیقی کمزوریوں کے خلاف کچھ کہے تو لوگ خفا ہو جاتے ہیں کیونکہ اس سے مغربی سامراج کے پنجۂ استبداد کو

اور مغربی تہذیب کے ذہنی تسلط کو تقویت پہنچتی ہے مگر خالدہ خانم کا جو اصل دعوئے ہے
کہ مشرق اپنی مادی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم نہیں کرسکا اور اسی وجہ سے مغرب کی
دست درازیوں کا شکار رہا اس کی کوئی تردید نہیں کرسکتا۔ اور اگر ایک طرف انھوں
نے یہ کہا ہے کہ یہ روحانیت پر حد سے زیادہ زور دینے کا نتیجہ ہے تو دوسری طرف
یہ بھی صاف صاف کہدیا ہے کہ مادیت پر حد سے زیادہ زور دینا مغرب کے لئے مہلک
ثابت ہورہا ہے۔ بہرحال خالدہ خانم جو مشرق کی طرف سے صدہا معرکوں میں داد شجاعت
دے چکی ہیں اگر اُس پر تنقید کریں تو اُسے تعریض نہیں بلکہ نصیحت سمجھنا چاہیئے

مشرق اور مغرب کی جو تعریف خالدہ خانم نے کی ہے میرے خیال میں وہ اس سے
مختلف نہیں ہے جو مشرقی اور مغربی ارباب فکر عام طور پر کرتے ہیں البتہ عالمگیر اسلامی
اتحاد کے متعلق ان کی جو رائے ہے اور مذہبی امور پر وہ جس طرح خالص علمی اور معروضی
پہلو سے بحث کرتی ہیں اُسے ہندوستان کے بہت سے مسلمان پسند نہیں کریں گے
یہ چیزیں جن کے متعلق بعض امور کی تشریح ضروری ہے۔

غیر ملکوں کے مسلمانوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ عالمگیر اسلامی
اتحاد کا تصور ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں کیا ہے مسلمانوں کو ہندوستان
میں آئے سات سو برس سے زیادہ ہوچکے ہیں اس عرصہ میں انھوں نے معاشرتی حیثیت
سے بھی اور سیاسی حیثیت سے بھی مہمان نوازی کا حق ادا کردیا۔ عرب۔ مصری۔ شامی
ترک۔ تاتاری۔ غرض جو قوم بھی آئی اُسے اپنے جوہر دکھانے اور اپنی محنت کا صلہ

پانے کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ مگر بیسویں صدی کا عالمگیر اسلامی اتحاد کچھ اور ہی چیز ہے۔ یہ محض اس اخوت اور مساوات کا مظاہرہ نہیں تھا کہ قابل لوگوں کو خواہ وہ کہیں سے بھی آئیں، ریاست اونچے ہاتھ دے اور ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھائے۔ بلکہ یہ اس قسم کی چیز تھی جیسی سولھویں صدی کی یہ کوشش کہ ہندوستان کا اور ترکی کا بیڑا مل کر پرتگال سے جو دونوں کا دشمن ہے مقابلہ کرے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا پہلا اظہار جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانے میں ترکوں کی فتح کی دعاؤں، برٹش ریلیف فنڈ، طبی مشن اور پھر تحریک خلافت کی شکل میں ہوا۔ اس کی اساس خیال یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان کمزور اور بے بس ہیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ سب کے سب مغربی سامراج کے مسلط ہیں۔ چونکہ تمام اسلامی ملکوں میں صرف ترکی آزاد ہے صرف اسی میں اتنا دم ہے کہ اپنے سے کہیں زیادہ قوی دشمن پر غالب آئے اور اتنی حمیت ہے کہ غلامی پر موت کو ترجیح دے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کے تخیل نے ان کو بھی اس طرح عالمگیر اسلامی اتحاد کا حامی سمجھا اور ان کے ذمے نہ صرف اپنے وطن کی حفاظت کا بلکہ خود اسلام اور کل عالم اسلام کی حمایت کا فرض عائد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ترک اس روحانی جذبے کو سمجھ سکتے تھے اور نہ اس شدید محبت کی تاب لا سکتے تھے۔ جب انھوں نے اس منصب کو جو [illegible] دیا جا رہا تھا قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہندوستانی مسلمانوں کے تخیلات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ نہ اس بات پر معروضی پہلو سے غور کر سکتے تھے نہ موضوعی پہلو سے۔ سچ پوچھیے

دان کا دماغ معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ انھیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ ان کے دل کے زخم بھر گئے ہیں اور اب وہ ان امور کو دوسرے زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے مگر ابھی تک ان کی زندگی پر تاریکی اور مایوسی چھائی ہوئی ہے اور ان کی امیدوں کی عمارتیں ہر طرف ٹوٹی پڑی ہیں۔ عالمگیر اسلامی اتحاد کا خیال جو کبھی ان کے لئے شمع ہدایت تھا اب داغ حسرت بن کر رہ گیا ہے۔ جو آفتاب کو گرماتی تھی ان کی روح کو تڑپاتی تھی اب اس کی یاد ان کے دل کو گرماتی ہے۔ خدا کی خدائی بدل گئی ہے کہ دنیا راستے سے بھٹک گئی ہے۔ سرکشی پہلے لگی ہے جو اسلام کے سوت تھے وہی اب دشمن بن گئے۔ گو یہ صورت حال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کتنی ہی الم ناک کیوں نہ ہو واقعہ یہ ہے کہ اتحاد اسلامی کے خیال کو ترک کرنے کی ذمہ داری ترکوں سے زیادہ دوسرے مسلمانوں پر ہے اس سے مراد ہندوستانی مسلمان نہیں ان کا قصور تو صرف یہ ہے کہ انھوں نے حالات اور واقعات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا ورنہ سمجھ جاتے کہ ترکوں کے دشمنوں کی طاقتور فوجوں میں ہندوستان کے مسلمان سپاہی شامل تھے اور عرب شریف کے مسلمانوں نے حال تک برطانوی حکومت میں رہ کر ترکوں کو نقصان پہنچایا اور ان کی مدد میں بھی کہ عرب نے بغاوت کی۔ مگر سلطنت عثمانی کی سلطان رعایا میں سے ترکوں کے اور جتنے لوگ تھے انھوں نے کھلی ہوئی غداری کی۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان کی شکایتیں حق بجانب تھیں یا نہیں مقصد کے لئے کافی ہے کہ یہ سب غیر ترک

طرز انھوں نے اختیار کیا اُسے دیکھنے کے بعد ترکی اتحاد اسلامی کے بڑے سے بڑے علم بردار کو بھی یقین ہوگیا کہ ان لوگوں میں اور ترکوں میں اتحاد عمل ممکن نہیں۔ اب عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوچکا ہے اور اس کی غیر ترکی رعایا کو وہ چیزیں حاصل ہوگئی ہیں جو وہ چاہتی تھی یا جس کی وہ مستحق تھی اس لئے ہم کو بھی یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ خلافت کا خاتمہ کر دینا ہی قرین مصلحت تھا اس لئے کہ خالی خولی وعدے سے شاید ان کی کچھ تھوڑی بہت دھاک تو بندھی رہتی مگر ایک طرف دشمنوں کی عداوت اور دوسری طرف خود غرض دوستوں کی مکاری ان کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوتی

ہندوستان میں عالم اسلامی کے اتحاد کا خیال اصل میں کوئی سیاسی چیز نہیں تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت پر اس کا اثر محض مذہبی حیثیت سے تھا اس لئے اتحاد اسلامی کی بحث کا سلسلہ خود بخود مذہب کی بحث سے اور اعتراضات سے جا ملتا ہے جو ہندوستان کے دل شکستہ مسلمان ترکوں پر مذہبی حیثیت سے کرتے ہیں وہ کہتے ہیں ممکن ہے خلافت کا خاتمہ کرنے میں ترک کسی حد تک حق بجانب ہوں مگر اس میں کیا مصلحت تھی کہ انھوں نے اپنا مذہب اپنا تمدن غرض اپنی ساری امتیازی خصوصیات کو چھوڑ کر پرائی تہذیب اور معاشرت اختیار کر لی جس کو پوری طرح اپنا بنانے میں غالباً وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے

ظاہر ہے کہ خالدہ خانم نے جب اپنے لکچروں کو ترتیب دیا تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات سے واقف نہیں تھیں اس لئے انھوں نے اس سوال کا

براہ راست کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ انھوں نے اول سے آخر تک معروضی طرز اختیار کیا ہے اور مذہب پر بھی اسی رنگ میں بحث کی ہے انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے کہ عبدالحمید کے زمانے تک قدامت پسندوں کی مخالفت کے باوجود سیاسی اور مذہبی جذبات میں ہم آہنگی تھی اور ان کا مقصد ایک تھا مگر جب سلطان عبدالحمید کے استبداد نے سیاسی خیالات کو کچلنا شروع کیا اور ظلم و تعدی کی انتہا کر دی تو تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں جذبات اور خیالات کی وہ ہم آہنگی باقی نہیں رہی۔ یہی سلطان تھا جس نے مصلحوں کو باغی بنایا اسی کی بدولت لوگ عاجز آ کر اس غلط اور خطرناک نظریئے کے قائل ہو گئے کہ قدیم تہذیب ایک بلا ہے جو ترکوں کو چمٹ کر ان کا خون پی رہی ہے اور جب تک ماضی کا خاتمہ نہ کر دیا جائے مستقبل کے لئے کوئی امید نہیں۔ اگر عبدالحمید کے ان مظالم کے بعد ترکوں کو کچھ دن امن نصیب ہوتا تو شاید وہ کچھ سنبھل جاتے مگر اس کے بجائے جنگ پر جنگ ہوتی رہی جس کی وجہ سے ملک کی فضا اضطراب، تعصب، خوف اور مصیبت سے معمور ہو گئی۔ اب بحث اور استدلال کا وقت نہیں تھا۔ اتنا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ لوگوں کا طرز خیال رفتہ رفتہ بدلے، سوائے تشدد سے کام لینے کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ ساری قوت ایک ہی فرد۔ کل پارٹی کے ہاتھ میں آ جانے سے اُن لوگوں کو بڑی آسانی ہو گئی جن کا یہ خیال تھا کہ ہر قدیم اور مشرقی چیز، ہر وہ چیز جو یورپ کی مایہ ناز مادیت اور مکانکی معاشرت کی مخالف ہے، ریاست کے اتحاد اور ترقی کی راہ میں حائل ہو گی ترکی جمہوریہ خالص مادی

حکومت بن گئی۔ مذہبی امور ایک سرکاری محکمے کے سپرد کردئے گئے جس کی نگرانی بڑی سختی سے کی جاتی ہے۔ اور جن کے قوانین عام ملکی قوانین کی طرح ریاست کی طرف سے وضع کئے جاتے ہیں جیسا کہ خالدہ خانم نے کہا ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کرنا نہیں بلکہ دست نگر بنانا ہے۔ مگر ارباب حکومت کو یہی روش پسند ہے

خالدہ خانم نے اپنے معروضی، معتدل، انداز میں ان سب اعتراضات کا ذکر کردیا ہے جو جمہوریہ ترکی کے مذہبی اور تمدنی طرز عمل پر کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ مجھے ان کی ذاتی رائے سے واقف ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ طرز عمل ان کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے۔ مگر ان میں اتنی قدر رواداری ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کو اچھی طرح جانتی ہیں اور انہیں یقین ہے کہ آخر الذکر باتوں سے گو اب نہیں پر ان سے ترکی ریاست کی پالیسی جو کچھ بھی ہو ترکی قوم اب بھی اسلام پر اسی طرح قائم ہے جیسے تھا۔ جیسا کہ خالدہ خانم کا خیال معلوم ہوتا ہے ترکی میں [illegible] اسلام [illegible] فروغ ہوگا اس کا اثر تمام [illegible] کے مسلمانوں پر پڑے گا۔

مگر ہمارے خیال میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا زاویہ نظر بہت تنگ ہے ہم ہر قوم میں جو مذہبی رجحان سے تعلق ہو یہ عجیب ہوتا ہے چنانچہ ہم جب کبھی [illegible] اپنے اصول [illegible] کے علاوہ [illegible] ہم [illegible] مسلمانوں کو بھی مذہب کا منکر سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مذہب اور ریاست

ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے اور جو جماعت جو مذہب کو نظر انداز کرتے

ہوئے ملت کی اجتماعی طرح ہمیشہ کمزور ہی پڑتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس قوم کا

بھی مذہبی جذبات ہوتی ہیں اور وہ کسی طرح نہیں چاہتی کہ مذہب زندگی کی مسائل

نباہے۔ اگر کسی مذہب ان کی طرح سے نہیں ہوتی کہ عقائد اور واقعات میں تطبیق

ہو لیتی ہے … زندگی کو … رکھ کر اپنا … روح

پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے … ہمارا … دین کے حقیقی مقاصد …

آہستہ … نسل اور معاشرے کے تغیرات کی وجہ سے

ہو جاتے ہیں … عبادت کا … سے اسی طرح

لیا جاتا ہے … سطحی چیزوں میں … یہ بات حقیقت کہ فراموش کر دیا ہے قوم کے

لئے مہلک ہوتا ہے۔ اسی طرح … احکام کی لفظی پابندی … ہلاکت

کا باعث ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس سے ایک طرح کی منطقی پستی پیدا ہو جاتی ہے

جو فطرت اور زندگی کو … ڈالتی ہے۔ اس لئے اس مذہب میں بھی جس کی شریعت

مدون ہوئی … کی گنجائش رہتی ہے۔ اسلام کا نام لیتے … کہ

خود مذہب اور اس کے قوانین میں کوئی نقص ہے جسے دور کرنا ہے اور نہ اس سے

یہ پہلو نکلتا ہے کہ … مذہب … کے لئے بنایا گیا تھا جو … کے مدارس میں

تشریح تھی اس لئے کہ قوموں کی رسوم و عادات اور ان کا ماحول بدلتا رہتا ہے۔ مگر

روحانی … اور بنیادی … میں کوئی تغیر نہیں۔ خدا کا پیام سنانے والے

کی آواز زمان و مکان میں گم نہیں ہو سکتی۔

میرے خیال میں ہمیں یہ چاہیئے کہ خالدہ خانم، اپنی قوم کی مذہبی روح کے متعلق جو کچھ کہتی ہیں اُسے تسلیم کرلیں اس لئے کہ اگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی تو انہیں اس کے اظہار میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ ہمیں یہ بات انوکھی معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے مذہب کا ذکر معروضی انداز میں کیا ہے اس لئے کہ ہم علمی بحثوں میں بھی مذہب کو جذبات سے الگ نہیں کرسکتے اور ہمارے یہاں ہر جماعت اپنی رائے کو قطعی سمجھتی ہے۔ مگر خالدہ خانم کا مقصد تبلیغ نہیں ہے بلکہ واقعات کو بے کم و کاست بیان کر دینا۔ انھوں نے تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا ہے اور جن مسائل میں اختلاف ہے ان کے متعلق ہر فریق کے دلائل پیش کر دیئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے لوگ اس سنجیدہ اور بے لاگ طرز بیان سے کہیں زیادہ جوش خطابت پسند کرتے ہیں یہاں صرف اتنا کہوں گا کہ خالدہ خانم کا علم ان کی ذات کی طرح اتنا وسیع ہے کہ ایک کتاب میں نہیں سما سکتا۔ ان کے ضبط میں وہ شان ہے جو گہرے پانی کی خاموشی میں ہوتی ہے۔ اُنھیں جوش میں لانے کے لئے ایسے واقعات کی ضرورت ہے جو دنیا کو تہ و بالا کر دیں

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ کتاب خالدہ خانم کے لکچروں کا ترمیم شدہ مجموعہ ہے ہندوستان کے قیام کے زمانے میں وہ خود اس قدر مصروف رہیں کہ لکچروں پر نظر ثانی نہ کرسکیں اور اتنا انتظار ناشر کو گوارا نہ تھا کہ وہ انھیں ساتھ لے جائیں اور فرصت

سے دیکھ کر بھیجیں۔ اس میں خدا جانے کتنی دیر لگ جاتی۔ اس لئے اس مجموعے کی تہذیب اور نظر ثانی کا کام محمد مجیب صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ کے سپرد کیا گیا پروفیسر مجیب کو اس کام کے ساتھ ساتھ کتاب کے پروف پڑھنے اور طباعت کے متعلق پریس کو ہر قسم کی ہدایات دینے کی زحمت بھی اٹھانی پڑی اس لئے اگر کہیں غلطی یا سہو ہو گیا ہو تو امید ہے کہ ناظرین معاف فرمائیں گے۔

مختار احمد انصاری

۳ر جون ۱۹۳۵ء



بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

پہلا خطبہ

خواتین و حضرات!

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مجھ سے آٹھ لکچروں کی فرمائش کی ہے ان کا موضوع "مشرق و مغرب کی کشمکش" ہے۔ اس کے مطالعے کے لئے ترکی کی تاریخ زیادہ تر اس وجہ سے منتخب کی گئی ہے کہ لکچر دینے والی وہیں پیدا ہوئی اور وہیں اس کی عمر گزری جن اتفاق سے یہ بات ہمارے مقصد کے لئے مفید ہے اس لئے کہ یوں تو مشرق اور مغرب کی کشمکش کا منظر ہر حصۂ عالم میں، ہر قوم کی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے مگر جس قدر واضح اور نمایاں یہ کشمکش، خصوصاً اس کے بعض پہلو ترکی کی قدیم اور جدید تاریخ میں ہیں اور کہیں نہیں اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) قدیم ترکی سلطنت اور موجودہ ترکی جمہوریہ دونوں کا مرکز وہ مقام ہے جہاں مشرق اور مغرب کی سرحد ملتی ہے یعنی مشرق ادنے۔

(۲) اسی خطے میں خالص مشرقی اور خالص مغربی قوموں اور تمدنوں نے نشو و نمایائی ہے۔
(۳) یہ خطہ تمام فلسفیانہ، تمدنی اور سیاسی نظریوں اور انسانی قوتوں کا میدانِ جنگ رہا ہے، غرض ترکی بہترین معمل ہے جس میں ایک مورخ مشرق اور مغرب کی کشمکش کے مسئلہ میں تحقیق کی داد دے سکتا ہے۔

شاید کوئی پوچھے کہ یہ مشرق کیا اور مغرب کیا؟ قرآن مجید میں تو ارشاد ہوا ہے کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً یہ بالکل سچ ہے کیونکہ انسان کا ڈھانچا سارے کا سارا ایک سا ہے۔ جسمانی حیثیت سے انسان تمام ہے سب سے برتر نوع کا جو عالمِ حیوانات نے ارتقاے حیات کی آخری سیڑھی ہے۔ اب رہا غیر مادی یا غیر مرئی عنصر یعنی نفس یا روح اس کے لحاظ سے بھی انسانوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ سب کہیں انسان کا نفس دوسرے حیوانوں کے نفس سے کم و بیش مختلف واقع ہوا ہے۔ وہ حصہ ہے اس غیر مرئی تخلیقی قوت کا جز ہے جو کائنات میں کارفرما ہے اگر ایک طرف اس کا سلسلہ عالمِ محسوسات میں بے شعور حیوانوں سے ملتا ہے تو دوسری طرف عالمِ معقولات میں خدائے علیم و خبیر تک پہنچ جاتا ہے۔ انسانی نسلوں میں رنگ، شکل، زبان اور تمدن کا جو فرق ہے اس کا باعث آب و ہوا کے اثرات اور زندگی کے حوادث یعنی طبیعی ماحول اور تاریخی حالات ہیں۔ پہلے قدیم اقوام کو لیجیے تو مصر، بابل اور ایران قدیم کے تمدن نظر آتے ہیں جنھوں نے مشرقِ ادنیٰ یا اس سے متصل خطوں میں نشو و نما پائی، اور ان تمدنوں پر جو یہاں آگے چل کر پیدا ہوئے بہت گہرا اثر ڈالا۔ ظاہری حیثیت سے ان کی سب سے نمایاں صفت وہ شان و شوکت ہے جو دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ وہ بلند

ایوان ہیں جن کے درو دیوار سے عظمت و جلال ٹپکتا ہے۔ دوسری چیز یہ نظر آتی ہے کہ یہ سارا کروفر صرف بادشاہ کے آرام و آسائش کے لئے ہے۔ قدیم مشرقی فرمانروا اتنے عظیم الشان ہیں کہ ان کی ذات ان کی رعایا کو بالکل چھپا لیتی ہے۔ رعایا کا کام تو بس اتنا ہی کہ اپنے سرمائے اور محنت سے چند افراد کی خاطر شاندار عمارتیں اور یادگاریں تعمیر کرے۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح بادشاہ کے اشارہ پہ ناچتی ہے ان تمدنوں کی تاریخ میں فرد اور قوم کے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے ان کے بنیادی اصول دو ہیں حکمراں طبقے کا استحکام اور اس کی راحت و بہبود۔

لیکن جب ہم اس انتہائی سیاسی استبداد کے دور میں مشرق کے فرد کو دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت و مسرت ہوتی ہے۔ فرد ہمیں ایک مخصوص اور ممتاز شخصیت کا مالک نظر آتا ہے اور اس معاملے میں وہ مغرب کے فرد سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس میں یہ بات کیسے پیدا ہوگئی ہے محض اس وجہ سے کہ اس نے اپنے ذہن کو مادی اسباب، اور دنیاوی امور سے الگ کرلیا ہے۔ بادشاہ کا قہر جب چاہے برق خرمن کی طرح چشم زدن میں اس کی کشتِ حیات کو جلا کر خاک کرسکتا ہے۔ مگر اُسے اس بلا کی فکر صرف اس وقت ہوتی ہے جب یہ سر پر آن پہنچتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ریاست تقدیر کی طرح اٹل ہے۔ میری مجال نہیں کہ اسے بدل سکوں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کی تاریخ میں ایسے واقعات شاذ ہیں کہ رعایا اٹھ کھڑی ہو اور سلطنت کے نظم و نسق میں حصہ پانے کا مطالبہ کرے ظاہر ہے کہ اس قسم کا انسان اپنی توجہ کا مرکز اپنی باطنی زندگی یعنی اپنی روح کو بنالیتا ہے۔ اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں دنیا کی نعمتیں اس کی دسترس سے باہر ہیں اس لئے اس کے نزدیک قدر کا مفہوم صرف

روحانی قدر ہے۔ اسے محض اتفاق نہ سمجھئے کہ مشرق جہاں ننانوے فیصدی لوگ اس قسم کی طبیعت رکھتے ہیں تمام زندہ مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔

اس کے بعد جس چیز کو مشرق کا انسان سب سے اہم سمجھتا ہے وہ افراد کے باہمی تعلقات ہیں۔ اسی لئے یہاں آداب معاشرت پر اس قدر زور دیا جاتا ہے۔ مروت اور اخلاق مشرق کا حصہ ہے۔ اس کا مطمح نظر سکونِ قلب ہے۔ وہ امن و عافیت قائم رکھنے اور تغیر سے محفوظ رہنے کے لئے ہر تدبیر اختیار کرتا ہے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ رسوم و روایات کو حد سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ ہر چیز جس میں روایات سے انحراف ہو اسے بری معلوم ہوتی ہے گو وہ اس کے رنج و مشقت کو ہلکا کرتی ہو۔ چین کے بعض شہروں میں اب تک سڑکوں پر چھڑکاؤ چھوٹی چھوٹی بالٹیوں سے کیا جاتا ہے۔ سب مشرقی کسان اپنے پرانے ہلوں کو زمین جوتنے کی مشینوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرزِ طبیعت کا فیض تھا کہ جمہور کی انتہائی عسرت اور معدودے چند امرا کے عیش و عشرت میں جو تضاد تھا اس نے کوئی معاشی انقلاب پیدا نہیں کیا۔

جو لوگ مشرقی طبیعت کے دلدادہ ہیں ان کا قول ہے کہ زندگی کی حقیقی قدریں اسی کے حصے میں آئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مشرق کے انسان نے اور چیزوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل موہر کو لے لیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ روحانی قدریں زیادہ اہم اور زیادہ قابل قدر ہیں مگر کیا مشرق کے متعلق یہ قول بالکل درست ہے؟ یہ تو جب سمجھتے جب انسان مجرد روح ہوتا مگر چونکہ وہ مادے اور روح سے مرکب ہے اس لئے سارا زور روح پر صرف کر دینے سے آخر میں بہت افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ مادی قدروں کو بالکل رد کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ

اہل مشرق کو پہلے تو ان کے حکمرانوں نے اور پھر مادہ پرست مغرب نے دل کھول کر لوٹا۔ مشرق کا مصرف بس یہ رہ گیا کہ اور ملکوں کو سستے مزدور بہم پہنچائے، اپنی دولت ان کے حوالے کرے، اور ان کا مال خریدے۔ جب یہ صورت ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرق میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مشرق کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے

اب مغرب کو لیجئے یہاں جلیل القدر بادشاہ اور عظیم الشان عمارتیں تاریخ پر چھائی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں سے کوئی بھی مغرب کا بنایا ہوا نہیں۔ مغربی تمدن اور مغربی انسان دونوں ابھی تھوڑے ہی دن پہلے صفحہ تاریخ پر نمودار ہوئے ہیں۔

مغرب نے اپنا مذہب مشرق سے پایا، حکمت و فلسفہ یونان سے حاصل کیا، اور حکومت کا نظام اور تمدن کا ظاہری ساز و سامان روما سے لیا۔ روما مغربی تمدن کا پہلا مظہر تھا۔ اس کی عمارت مغرب کے لوگوں نے پہلے پہل مغرب ہی کی سرزمین پر تعمیر کی۔ اگرچہ اہل روما نے اپنے ذہن سے کوئی نیا تصور پیدا نہیں کیا مگر موجودہ تصورات کی ترکیب انھوں نے کچھ اس طرح کی کہ ایک نیا تمدن بنا کر کھڑا کر دیا۔

سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز جو اہل روما نے خود اختراع کی وہ ان کا اصول قانون ہے مشرق میں قانون خدا کا بنایا ہوا یا بادشاہ کا بنایا ہوا ہوتا تھا روما میں وہ انسان کا بنایا ہوا ہوتا تھا اور جمہور کی مرضی سے بنایا جاتا تھا عملاً اس کی کوئی خاص اہمیت

نہ تھی مگر اس نے زندگی کا ایک نیا تصور پیدا کر دیا فرد کی نظر میں قانون کا رعب اس حد تک نہ تھا کہ اسے تقدیر کے مانند اٹل سمجھتا۔ اس نے اپنے خیال کو معاشرت اور ریاست سے کبھی ہٹنے نہیں دیا اور ہمیشہ اس جدوجہد میں رہا کہ حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ ظاہر ہے کہ ایسی طبیعت کا آدمی مشاہدۂ باطن میں محو نہیں ہو سکتا۔ اس کی توجہ کا مرکز ہمیشہ اس کا جسم اور دوسری مادی اشیاء رہا کرتی ہیں جن چیزوں کو وہ دیکھ سکتا ہے اور چھو سکتا ہے وہ اس کی نظر میں غیر محسوس چیزوں سے زیادہ قدر رکھتی ہیں۔ بعض مختصر زمانوں اور بعض مخصوص اشخاص سے قطع نظر کر کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی انسان صرف مادّی قدروں کا قائل ہے۔ غور و فکر اس کے نزدیک بے معنی لفظ ہے جدوجہد اور عمل حاصلِ زندگی ہے۔

مذہبِ عیسوی سے یہ امید تھی کہ وہ اس انتہائی مادیت کو جو اہل مغرب نے اہل روما سے ورثے میں پائی تھی حدِ اعتدال پر لائے گا اور اس میں روحانیت کی شان پیدا کرے گا مگر مغربی نصرانیت کو حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے بہت کم تعلق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے کچھ عرصے کے لئے اہل مغرب میں روحانیت کا رنگ پیدا کر دیا اور انھیں متحد کر کے ایک ملت بنا دیا۔ مگر مجموعی حیثیت سے خود نصرانیت مغرب میں جا کر بالکل بدل گئی۔

جس مذہب کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی تھی اس کا اصل اصول امن پسندی تھا۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا تھا کہ اگر کوئی تمھارے بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا داہنا گال بھی سامنے کر دو۔ مگر عیسائیوں نے اس کا خاص اہتمام کیا کہ دنیا

بس ہر امن پسند شخص کے منہ پر تھپڑ لگائیں۔
عیسائیوں کو یہ تلقین کی گئی تھی۔ کہ اگر تمہارے پاس دو عبائیں ہو تو ایک قبا حیرت کر دو اگر وہ اس پر عمل کرتے تو مادی دولت کی تقسیم بہت بہتر ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ گو مغرب میں ایک معمولی آدمی بھی اپنے مشرقی بھائی سے زیادہ خوش حال ہے پھر بھی تقسیم دولت اس قدر ناقص ہے کہ زردار اور بے زر یعنی سرمایہ دار اور مزدور میں بڑی زبردست جنگ چھڑ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داروں کے خلاف جو شورش برپا ہے وہ جسمی حاسی اسباب پر مبنی ہے مگر اس میں اہل مغرب کی ترکیب نفسی کو بھی بہت کچھ دخل ہے مشرق میں یہی حالت ہے بلکہ اس سے بھی بدتر مگر شورش کا نام بھی نہیں
اسی مادیت کی بدولت مغرب نے سائنس میں حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں اس نے فطرت کے اسرار کا پردہ چاک کر دیا ہے اور اس کی قوتوں سے کام لے کر انسان کی راحت و آرام کا سامان بہم پہنچایا ہے جس طرح مشرق کے عارف نوع انسانی کی روحانی تسکین کی تلاش میں شہید ہو جاتے تھے اسی طرح مغرب کے عالم اس کوشش میں جان دیدیتے ہیں کہ اس دنیا کو اپنے بنی نوع کے لئے زیادہ آرام دہ بنا دیں۔ اور انھیں بیماریوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھیں
مگر مغرب کی یہ نعمت دنیا کے لئے مصیبت ہو گئی ہے۔ اس یک طرفہ اور خالص مادی ترقی نے مغرب کو اور اقلیموں پر مسلط کر دیا ہے۔ چند صدیوں کے اندر ساری دنیا بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے نیچے میں آگئی ہے۔ بڑے بڑے براعظم اور اس کے

کروڑوں باشندے اب اسی کام کے لئے ہیں کہ اس چھوٹے سے خطّے کی اطاعت میں سرگرم رہیں جو یورپ کہلاتا ہے اور جہاں مغربی انسان رہتا ہے۔

جو لوگ مغربی طبیعت کے دلدادہ ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقی قدریں اسی کے حصّے میں آئی ہیں ان کا دعوےٰ ہو کہ زندگی کا اصلی جوہر انسان کی مادّی فطرت ہے۔ کیا یہ دعوےٰ بالکل صحیح ہے؟ یہ تو ہم تب سمجھتے جب انسان اپنی انسانیت یا یوں کہئیے کہ روحانیت کھو بیٹھتا، جانوروں کی طرح اس کی ضروریات اور خواہشات محض جسم تک محدود ہوتیں۔ مگر چونکہ وہ روح اور مادے سے مرکب ہے اس لئے مادّے پر سارا زور صرف کرنے سے بھی آخر کار افسوس ناک نتائج پیدا ہوئے۔ ایسے آثار نظر آ رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کا تنزل بلکہ خاتمہ قریب ہے۔ اہل مغرب اپنے تمدن کی عمارت کو متزلزل دیکھ کر بہت ہراساں ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادّی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے کون سی راہ اختیار کریں قدیم مشرق کی طرح مغرب کو بھی گھن لگ چکا ہے سیدھی سی بات یہ ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادّی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ ان دو نفسی کیفیتوں یعنی اعتدال سے بڑھی ہوئی مادّیت اور روحانیت کا ترکی تاریخ کے تین پہلوؤں یعنی (۱) بنائے سلطنت (۲) ذہنی تربیت۔ (۳) معاشرتی زندگی میں کیا حال رہا ان میں کس حد تک کشمکش رہی اور کہاں تک اتحاد پیدا ہوا۔

۴۔ عثمانی ترک بانیانِ سلطنت کی حیثیت سے

عثمانی ترک مشرق ادنیٰ میں پہنچ کر جس کی تاریخ نے صدیوں تک انھیں کے ہاتھوں تشکیل پائی، بہت سے تاریخی اثرات سے متاثر ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے

یہی سرزمین کسی زمانے میں یونانی قوم کا گہوارہ تھی ظاہر ہے کہ یونانیوں کے ذہنی اور تمدنی اثرات دنیا پر حاوی ہیں مگر ان کے تمدن میں توجہ کا مرکز عالم طبیعی تھا اس لئے ان کا تمدن کہیں تو بجا نہ ہوگا۔ گو سقراط کو ایک چھوٹے سے جن کا احساس خاص سے مراد روح ہے مگر اس میں اور روح کے اس تصور میں جس کا ذکر مشرقی مذاہب میں بہت فرق ہے۔

خیر ہمیں صرف ان کے سیاسی نصب العین اور خیالات سے سروکار ہے۔

جمہوریت جو لفظ (DEMOCRACY) جس کا ترجمہ شوری حکومت یا جمہوریت ہے دنیا کی زبانوں میں قدیم یونان سے آیا ہے۔ جمہوریت کی جو شکل یورپ میں پائی جاتی ہے اس کی ابتدا یونانیوں ہی نے کی تھی ان کے یہاں ہر فرد کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا کہ فرد کے مقاصد کو پورا کرے

افلاطون کی ریاست پہلی معرکۃ الآرا کتاب جس میں ایک فرضی ریاست کا تخیل پیش کیا گیا یونان ہی میں لکھی گئی۔ یہ افلاطون کی ریاست تھی۔ اس میں بعض ایسے اصول

ہیں جو ہماری موجودہ جمہوریت سے مطابقت نہیں رکھے۔ اصل میں یہ چھوٹی ریاستوں خصوصاً یونان کی ریاستوں کے لئے لکھی گئی تھی اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حکمرانوں کا ایک طبقہ منتخب کیا گیا ہے اور اس کی تربیت کے لئے بہت وضاحت اور سختی سے اصول و ضوابط معین کر دیے گئے ہیں یونان کی جمہوری ریاستوں نے افلاطون کے نظریے پر عمل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی حکومت نہ ماہرین فن کے ہاتھ میں تھی نہ کسی جداگانہ طبقے کے ہاتھ میں جسے خاص طور پر تربیت دی گئی ہو بلکہ ان کے ہاں جمہور کی رائے سے حکومت ہوتی تھی۔ یہ ریاستیں بہت تھوڑے دن قائم رہیں۔

ان کے بعد رومہ کی باری آئی۔ رومی سلطنت ان سے کہیں زیادہ منظم تھی۔ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے حصے پر اور زیادہ سے زیادہ قوموں پر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ اس کی بنیاد بھی یونانی ریاست کی طرح مادیت اور صابیت پر تھی، اہل رومہ کو اس کا ملکہ تھا کہ ہر قوت سے فائدہ اٹھا کر اپنی ریاست کا کام نکال لیتے تھے مصلحت بینی اور موقع شناسی ان کے حصہ کی چیز تھی۔ برخلاف یونانیوں کے وہ ریاست کو فرد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے یہاں تک کہ ان کا نام بھی کسی نسل کا نام نہیں بلکہ ان کے دارالسلطنت سے منسوب ہے۔ ہر نسل اور قوم کا آدمی رومی کہلا سکتا تھا۔ اور رومی سلطنت کی شہرت کو ہر چیز پر مقدم رکھنا تھا۔

بازنطینی سلطنت | بازنطینی سلطنت جو رومہ کی جانشین تھی یونانی رنگ میں ڈوبی ہوئی

تھی جب بیرونی حملوں سے رومہ کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یورپ کے یونانی اواربوں اور سلافیوں کے ہاتھوں اور ایشیا کے یونانی ۔ بوں کے ہاتھوں جلاوطن ہو کر قسطنطنیہ میں جمع ہوئے اور انھوں نے اس کے نظم و نسق کو یونانی طرز پر ڈھالا ۔ لاطینی زبان کی جگہ یونانی نے لی ۔ بازنطینی سلطنت کا ایک سرا بلقان تھا اور دوسرا اناطولیہ کا جزیرہ نما ۔ آئے عمل بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور وہ دونوں طرف اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتی تھی اس لئے اس نے زیادہ زور اناطولیہ پر صرف کیا ۔ چھٹی صدی کے بعد سے اناطولیہ پر یونانی اور عیسوی رنگ غالب رہا اور وہاں یونانی زبان رائج ہو گئی ۔ اصلی باشندے یعنی مسی اور فریجی وغیرہ نو آبادیوں میں گم ہو گئے ۔ مگر اس نئے تمدن کا اثر کسانوں پر زیادہ نہیں پڑا ۔ بہر حال بازنطینی سلطنت یہیں سے روپیہ اور فوجیں لے کر بلقان میں دشمنوں کا مقابلہ کرتی رہی ۔ جب یہ خطہ اس قدر لوٹا جا چکا کہ اور زیادہ گنجایش نہ رہی تو سلطنت کا زوال شروع ہو گیا ۔ پہلے اناطولیہ کا وسطی حصہ بازنطینی سلطنت سے الگ ہوا پھر رفتہ رفتہ اور خطے بھی آزاد ہو گئے یوں کہنے کو ابھی اناطولیہ میں بازنطینی حکومت باقی تھی، مگر اصل میں اس کا تسلط اٹھ چکا تھا ۔

<u>ترکوں کا ورود</u> اس یونانی رومی سلطنت کے انحطاط کے زمانے میں ترک اناطولیہ میں آئے آٹھویں صدی سے ان کے حملوں کا زور بڑھنے لگا گیارھویں صدی میں سلجوقی ترکوں نے وسطی اور مغربی اناطولیہ میں اپنی ریاست قائم کر لی انھوں نے اس خطے کو پوری طرح ترکی اور اسلامی رنگ میں رنگ لیا تمام لوگوں نے مذہب اسلام اور ترکی زبان اختیار

کرلی۔ اس مذہبی اور تمدنی انقلاب میں تشدد سے مطلق کام نہیں لیا گیا ۔ تیرھویں صدی میں دولت سلجوقیہ پر زوال آگیا۔ مگر ان سب خطوں پر جو اس کی قلمرو میں رہ چکے تھے ترکی اور اسلامی رنگ بدستور غالب رہا۔

عثمانی ترک | تیرھویں صدی میں اسی ایشائے کوچک میں جو ترکی اور اسلامی اثر قبول کر چکا تھا۔ مگر اب زوال کی حالت میں تھا عثمانی ترک وارد ہوئے ان کا نام کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے پہلے سلطان سے منسوب ہے رومی کی طرح عثمانی بھی ہر نسل و قوم کا شخص ہو سکتا تھا۔ اب لفظ عثمانی کا مفہوم ایک مخصوص نظام سلطنت ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ عثمانی ترکوں کی تعداد کس قدر قلیل تھی اور انھوں نے کس قدر کم مدت میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔ ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ عثمانی سلطنت کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا۔

مغربی مورخ، خصوصاً اس دور انحطاط کے لکھنے والے جب سیاسی جذبات علمی دنیا پر چھائے ہوئے تھے، عثمانی سلطنت کو خانہ بدوشوں کی حکومت کہہ کر توجہ کے لایق نہیں سمجھتے اور اس کے اتنے عرصہ قائم رہنے کا باعث ترکوں کی فطری جنگجوئی کو قرار دیتے ہیں۔ ابن خلدون جو اہل مغرب کے نزدیک قدیم اسلامی دنیا میں فلسفہ تاریخ اور علم انبات کا سب سے بڑا عالم تھا کہتا ہے کہ خانہ بدوش قوموں کی حکومت تین پشت یعنی ایک سو بیس سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔ تاریخی شہادت سے اس کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی ریاست دو سو سال بھی چلی ہے مگر اس کی

شمالیں تاؤس مغل جنھوں نے شمال مشرق سے اناطولیہ پر حملہ کیا اور مغرب تک بڑھتے چلے گئے خانہ بدوش بھی تھے اور جنگجو بھی مگر انھوں نے کوئی ریاست، جو واقعی ریاست کہی جا سکے قائم نہیں کی۔ سلجوقی ایران سے ملک داری کا تجربہ لے کر آئے مگر ان کی حکومت بھی دو سو سال سے زیادہ نہیں چلی۔ بازنطینی جن کے سامنے روما کی مثال تھی، جو قدیم یونان کے علم کے وارث تھے اور اعلیٰ درجہ کی قوت تنظیم رکھتے تھے ایسی تمام سلطنت جیسی رومیوں کی تھی قائم نہیں کر سکے۔ اس لئے عثمانیوں میں جنگ جو خانہ بدوشوں کی جسمانی صفات اور ان کے مخصوص اور سادہ طرز حکومت کے علاوہ اور بھی کوئی خاص صفت، خاص قابلیت ہوگی کہ انھوں نے اپنی پائدار اور کامیاب سلطنت تعمیر کی۔ اس لئے اگر ہم اختصار کے ساتھ ان روایات اور اثرات کا مطالعہ کریں جن کی بدولت انھیں یہ قابلیت حاصل ہوئی تو فائدے سے خالی نہ ہوگا

اس میں شک نہیں کہ عثمانی ایشیائے کوچک میں خانہ بدوشوں کی حیثیت سے آئے ان میں سادہ زندگی کی صفات، یعنی بہادری قوت تنظیم اور وہ تمام صفات موجود تھیں جو ان قوموں کے حصے میں آئی ہیں جنھیں ہمیشہ طبعی قوتوں سے لڑنا اور فطرت کے تغیرات و حوادث کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدھے سادے خانہ بدوش ترکوں نے ان قوموں کو جو ان سے زیادہ متمدن مگر ان سے کم جفاکش تھیں مغلوب کر کے اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔ عثمانی ترکوں کو ملک داری کا کوئی تجربہ نہ تھا، عہد ماضی سے انھیں صرف روایات کا خزانہ اور عوام کے ادب و حکمت کا ذخیرہ ورثے میں ملا تھا جو ایک

نسل سے دوسری نسل تک زبانی منتقل ہوتا چلا آتا تھا، اور وہی ان کے بچوں کی تعلیم کا ذریعہ تھا۔

نہ صرف قدیم بلکہ جدید ترکی تاریخ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہمیں ایک نظر ترکوں کی اس زندگی پر، جو مشرق اوتی میں آنے سے پہلی تھی، ڈالنی پڑے گی۔

ترکوں کا ذکر تاریخ میں پانچویں صدی عیسوی سے آتا ہے چینی تاریخ میں ان کا نام توکیو اور بازنطینی تاریخ میں ترکی ہے۔

پانچویں اور گیارہویں صدی کے درمیان ترک سرگرمی اور قوت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، اگر آپ ان صدیوں میں ان کی جدوجہد کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو ذرا ایشیا کے نقشہ کو دیکھئے اور پہاڑوں، دریاؤں اور وادیوں کے نام پڑھئے۔ علاوہ اس جدوجہد کے قدیم مغل ترک جنھیں مغرب کے لوگ وحشی اور خانہ بدوش کہتے ہیں، ملک گیری اور ملک داری کے عزم سے نکلنے سے پہلے اپنے خاص تمدن رکھتے تھے۔ ان میں سے سب سے قدیم تمدن جواب تک دریافت ہوئے ہیں ان کے گھر مغلستان اور چین کے سرحدی علاقے تھے۔ ان میں سب سے مشہور طرفانہ کا خطہ ہے۔ ٹامسن نے ۱۸۹۳ء میں اس کے کھنڈروں کے کتبے پڑھے تھے۔ ان میں ترکوں کے بادشاہ گل تگین نے اپنی قوم کی تاریخ بیان کی ہے بہت سے الفاظ اور محاورات جو ان کتبوں میں آئے ہیں آج بھی اناطولیہ کی خانہ بدوش قوموں کی زبان پر ہیں۔

"اوپر نیلا آسمان تھا اور نیچے تاریکی جب انسان پیدا ہوا اور اسے دنیا کی حکومت

سپرد کی گئی۔ اس مبارک زمانے میں بادشاہ اور وزیر بہادر اور دانشمند ہوا کرتے تھے۔ مگر اس روشن زمانے کے بعد ایک تاریک زمانہ آیا۔ بیٹے ویسے نہ رہے جیسے باپ تھے بادشاہ اور وزیر بزدل ہونے لگے اور لوگ بری راہ چلنے لگے۔ ان خرابیوں سے فائدہ اٹھا کر چینیوں نے سلطنت کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ ہمارے سردار چینیوں سے مل گئے اور انعام اور خطابات پانے لگے۔ مگر ترکوں کے خدا نے بلقہ خان کو بھیجا کہ ترکوں کی نسل کو مٹنے نہ دے۔"

آگے ان کتبوں میں اس کا ذکر ہے کہ اس حکمران نے منتشر قبائل کو جمع کر کے منظم کیا دشمنوں پر فتح پائی اور اپنی قوم کی تعداد میں اضافہ کیا۔ اس نے غریبوں کو دولتمند کر دیا اور دنیا میں اپنی قوم کا ڈنکا بجا دیا۔ ان کتبات میں اول سے آخر تک ایک ایسی قوم کی تصویر ہے جو آزادی کی شیدا ہے اور غیروں کی حکومت سے ہمیشہ لڑنے کو طیار رہتی ہے یہی نہیں بلکہ وہ اپنوں کی حکومت میں بھی ظلم کے روادار نہیں۔ ایک نیا بادشاہ جو بیتو خان کہلاتا ہے رعایا پر ظلم کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ بہت سے ترک اپنا ملک چھوڑ کر چین میں پناہ لیتے ہیں آخر لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں بیتو خان کو قتل کر دیتے ہیں اب بلقہ خان ثانی کا زمانہ آتا ہے۔ ترکوں کی ہجرت چین کے ذکر میں ایک بڑا لطیف جملہ ہے "چینیوں کا سونا چاندی ان کی شرابیں اور ریشمی لباس بہت خوبصورت ہیں۔ مگر وہ ترکوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیتے ہیں۔ اُتکین میں جو ترکوں کا ملک ہے، یہ چیزیں نہیں ہیں مگر وہاں آزادی ہے۔"

یہ سادگی اور قوت تھی جسے لے کر عثمانی ترک مشرق ادنیٰ میں آئے۔ اس کی سرحد پر

انھوں نے مذہب اسلام اختیار کیا سر حدیر میں نے اس وجہ سے کہا کہ ارطغرل کا دادا شامانی مذہب پر قائم تھا اور ترکوں کا قبول اسلام ابھی تھوڑے ہی دن کی بات تھی ان کے نام اب تک زمانہ قبل اسلام کی طرح دن، چاند، چٹان، شیر فولاد وغیرہ کے ہم معنی الفاظ ہوا کرتے تھے۔ ابتدائی عہد بروصہ میں یہ نام کثرت سے ملتے ہیں غالباً ان کی نظر میں اسلام کی شان وہ ہوگی جو ایچ جی ویلس کی تاریخ عالم کی اس عبارت میں دکھائی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رسول مقبول کے آخری خطبے نے مسلمانوں میں قتل وغارت اور خانہ جنگیوں کا خاتمہ کر دیا، حبشی مومن کو خلیفہ وقت کا بھائی بنا دیا۔ دنیا میں عدل انصاف کی روایات قائم کر دیں۔ اس کے الفاظ خلق و احسان کی روح سے معمور ہیں، فطرت انسانی کے مطابق اور قابل عمل ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا ظلم و جور سے پاک نظام معاشرت قائم کر دیا جیسا دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا"

ان لوگوں نے شمالی مغربی اناطولیہ میں، جہاں ابھی تک مذہب اسلام اور ترکی زبان پورے ملک میں نہیں پھیلنے پائی تھی۔ اپنی ریاست قائم کی۔ ابتدائی عہد بروصہ دجوان کے پہلے دارالسلطنت بروصہ سے منسوب ہے) ان کی زندگی پر ترکی، حریت پسندی اسلامی اخوت اور مساوات کا رنگ غالب تھا ان کا سلطان ساری قوم کی طرح سادگی اور کفایت شعاری سے بسر کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، لوگوں کے جھگڑے چکاتا تھا اور مقدمے فیصل کرتا تھا، ہیمر نے ایک مقدمہ کا ذکر کیا ہے جس میں سلطان نے ایک مسلمان کے مقابلے میں ایک غریب عیسائی کے حق میں فیصلہ کیا ایسے واقعات

اور بھی خدا جانے کتنے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ بازنطین کے ذہین نوجوان خوشی سے
ان کی جماعت میں شریک ہو گئے اور انھوں نے صدق دل سے مذہب اسلام قبول
کرلیا۔ اور یونانیوں کے گروہ کے گروہ آس پاس کے شہروں سے آکر ان کی ریاست
میں بس گئے۔ عثمانی رعایا ہونے کو لوگ بڑی نعمت سمجھتے تھے۔

عثمانی ریاست کے پیچھے بہت دور تک مسلمان ترکوں کی گتھی ہوئی آبادی تھی۔
اگرچہ وہ الگ الگ ریاستوں میں تقسیم تھی اور آگے یورپ (بلقان) اور بازنطین کا وہ
حصہ تھا جہاں اب تک عیسائیوں کی حکومت تھی

قاعدے سے تو عثمانیوں کو سب سے پہلے اناطولیہ فتح کرنا چاہئے تھا تاکہ
ایشیائے کوچک میں ایک متحدہ قومی سلطنت قائم ہوسکے۔ مگر انھیں یہ منظور ہی نہ تھا۔
کہ قومی سلطنت قائم کریں۔

اس کے علاوہ ایک ابھرتی قوم کے لئے جو توسیع چاہتی تھی یہ تدبیر تھی کہ مشرقی یورپ
اور بازنطین کو فتح کرے۔ مگر یہ کوئی سہل کام نہیں تھا رومی سلطنت کے زوال کے بعد
سے کسی نے اس کی ہمت نہیں کی تھی۔ ترکوں کی قوم ایک جنگجو قوم تھی۔ اس نے
آسان راہ کو چھوڑ کر اس ہفتخواں کو سر کرنے کی ٹھان لی۔ اس کی مشکل پسندی اس بات
سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے بازنطین سے پہلے بلقان کو فتح کیا تسخیر مقصود نہیں
عثمانی فوجوں کے بعض سپہ سالار یونانی نسل کے بھی تھے جن میں اورانوس بے کا نام
سب سے زیادہ مشہور ہے۔

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ وہ نوجوان یونانی جو قبول اسلام کے بعد زبردست سپہ سالار یا مدبرین بن گئے پہلے بازنطینی سلطنت کی رعایا تھے۔ مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بازنطینی اہل مقدونیہ کی تالیف قلوب نہیں کر سکے تھے۔ میں یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا چاہتی ہوں کہ انسانوں میں قابلیت کا جو فرق ہوتا ہے اس کی بنیاد نسل سے زیادہ ماحول، تربیت اور عقیدے پر ہوتی ہے۔ غرض بلقان فتح ہو گیا۔ اور عثمانیوں کا مرکز حکومت یورپ میں منتقل ہو گیا۔ اور نہ داڑریانویل، ان کا دوسرا دارالسلطنت قرار پایا۔

غالباً جنگ کے ختم ہوتے ہی عثمانیوں نے مقدونیہ کے باشندوں کی نفسی خصوصیات اور ملک کے حالات اور ضروریات کا صحیح اندازہ کر لیا جو ان سے پہلے صرف رومی کر پائے تھے اہل مقدونیہ بہت تند مزاج واقع ہوئے تھے اور ان میں ہر طرح کے اختلافات موجود تھے اس لئے ہمیشہ خانہ جنگی ہوتی رہی تھی۔ ان کے ساتھ سختی بلکہ جبر سے پیش آنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ اصول ہر جگہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ ان لوگوں میں کم سے کم ایک رشتہ اتحاد موجود تھا اور یہ مذہب عیسوی تھا جو انھوں نے حال ہی میں اختیار کیا تھا اس کا احترام کرنا بہت ضروری تھا ان شرطوں کو وہی ریاست پورا کر سکتی تھی۔ جس میں قوت بھی ہو اور تنظیم بھی جو استبداد پسند بھی ہو اور حریت پسند بھی۔ استبداد اور حریت کا اکٹھا ہونا اجتماع ضدین معلوم ہوتا ہے مگر عثمانیوں نے اسے بھی کر دکھایا۔

عثمانی حکومت کا نظام جو بظاہر ان متضاد اصولوں پر مبنی ہے اور نہ اور قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مگر اس کی نشوونما ان فتوحات کے دوران میں اور ان کے

بعد ہوئی۔ شاید اس لئے کہ اس وقت حاکموں کو محکوموں کی سیرت کا مطالعہ زیادہ قریب سے، زیادہ گہری نظر سے کرنے کا موقع ملا۔ ۱۴۵۳ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے اپنا تیسرا دارالسلطنت قرار دیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عثمانیوں کے فلسفہ سیاست پر ان کے ابتدائی سادہ خیالات کے علاوہ اور کن کن خیالات کا اثر پڑا۔

عثمانی ترکوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یونانیوں سے بازنطینیوں کے توسط سے پڑا۔ ان کے شہزادے بازنطین کی شہزادیوں سے شادی کرتے تھے۔ یہ شہزادے اور دوسرے نوجوان تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجے جاتے تھے۔ اور یونانی اور لاطینی زبانوں میں مہارت پیدا کرتے تھے۔ سلطان محمد فاتح نے بھی وہیں تعلیم پائی تھی اور ان زبانوں پر عبور حاصل کیا تھا۔ اس لئے یقیناً ان لوگوں نے افلاطون کی "ریاست" اصل یونانی زبان میں پڑھی ہوگی اس کے علاوہ قسطنطنیہ میں رہ کر انھوں نے بازنطین کے نظام حکومت اور سیاسی خیالات کا بھی غور سے مطالعہ کیا ہوگا۔ گو انھوں نے بازنطینی تمدن سے اچھے برے دونوں طرح کے اثرات قبول کئے مگر اس کے نظام سلطنت کو وہ ضرور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے انھوں نے اس کا بھی اندازہ کرلیا ہوگا۔ کہ لاطینی قومیں اور مغربی یورپ کی ریاستیں جن سے بازنطینی مدد مانگا کرتے تھے۔ ان دنوں کوئی قابل ذکر اصول سیاست نہیں رکھتی تھیں ایڈورڈ گبن نے "زوال روما" میں دکھایا ہے کہ لاطینی اور مغربی ملکوں کی فوجیں جو بازنطینیوں

کی مدد کے لئے آتی تھیں خود یونانیوں کو لوٹتی اور قتل کرتی تھیں اور وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ عثمانیوں کی سی تیز اور من چلی طبیعت رکھنے والی قوم نے حسبِ ذیل امور کی اہمیت اچھی طرح سمجھ لی ہوگی:-

(۱) آٹھویں صدی سے مشرقی یورپ اور بازنطین میں امن و امان مفقود تھا۔

(۲) بازنطینیوں میں اور ان سست مشرقی قوموں میں جن پر دوسرے ترک حکومت کرتے تھے، بہت فرق تھا

(۳) صرف ایک سلطنت اس خطے میں نظم وضبط قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی اور وہ رومی سلطنت تھی۔ اس لئے رومہ سے سبق لینا ضروری تھا۔ اس کی قوت اور استبداد اور اس کی مصلحت بینی اس زمانے کے عثمانیوں کو بہت پسند آئی۔

عثمانیوں کے سیاسی مزاج نے جن اجزا سے ترکیب پائی ان کا ریاضی ضابطہ اس شکل کا ہوگا۔ عثمانی قوم کی طاقت اور بدویانہ صفات اسلامی عدل ومساوات یونانیوں کی جسمانی تربیت کے اصول بازنطینی تنظیم رومیوں کی مصلحت بینی اور قوت افلاطون کی "ریاست" کے نظریات۔

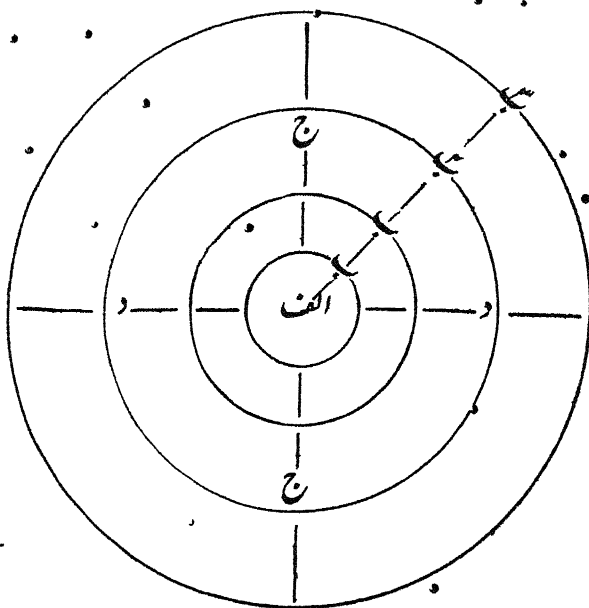
افلاطون کی ریاست کے ذکر پر بعض حضرات دور از کار قیاس آرائی سمجھیں گے مگر عثمانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں میں اور لوگوں نے بھی اس کے اثر کو قبول کیا ہے۔ پروفیسر لی بائر، جن کی کتاب "سلیمان اعظم" میرے خیال میں عثمانی نظام سلطنت کے متعلق زمانۂ حال کی تصانیف میں سب سے مستند اور جدید تصنیف ہے اسی نتیجے پر پہنچے

ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"غالباً دنیا میں عثمانی نظام حکومت سے زیادہ دلیرانہ تجربہ اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کیا گیا ہوگا۔ جو نظام اس کے اصول سے سب سے زیادہ مشابہ ہے وہ افلاطون کی ریاست کا نظام ہے۔

افلاطون سلطان کے خاندان کی تعلیم و تربیت کو دیکھتا تو بہت خوش ہوتا گو اس خاندان کی کم اصلی اس کی طبیعت کو مکدر کر دیتی۔ جو چیزیں اسے پسند آتیں وہ یہ تھیں کہ تعلیم عمر بھر جاری رہتی تھی، جسم اور ذہن کی یکساں تربیت ہوتی تھی، حکمرانوں اور سپاہیوں میں تفریق کی جاتی تھی، یہ لوگ ایک حد تک گھر بار کی پابندیوں سے آزاد رکھے جاتے تھے، مرد کی ساری زندگی مجموعی نظام کے ماتحت تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت دانشمندوں کے طبقے کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تو شاید کبھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ عثمانی سلطنت کے بانی افلاطون کے خیالات سے واقف تھے یا نہیں مگر ان کے حیرت انگیز نظام حکومت نے افلاطون کے منصوبے کو جہاں تک اس کا پورا ہونا ممکن تھا پورا کر دیا۔"

میں آپ کو ایک آسان نقشے کی مدد سے سلطنت عثمانیہ کے بنیادی عناصر دکھانا چاہتی ہوں۔



الف + ب + ب۱ + ب۲ + ب۳ + ج + د = سلطنت عثمانیہ

(الف) کا اندرونی دائرہ مرکزی ریاست کو ظاہر کرتا ہے جو مقننہ اور عاملہ سے مل کر بنی ہے۔ یہ دونوں عناصر ملکی اور فوجی تقسیم کے اندر شامل ہیں۔ ابتدا میں ملکی اور فوجی میں کوئی خاص حد فاصل نہ تھی۔ اس دائرے کا مرکز اور اس ہیئت اجتماعی کا افسر اعلیٰ سلطان تھا۔ صرف وہی ایک شخص تھا جس کے موروثی حقوق تسلیم کئے جاتے تھے مگر یہ حقوق خدا داد نہیں سمجھے جاتے تھے۔ وہ اپنی فوج میں ایک معمولی سپاہی کا درجہ رکھتا تھا اور اسے بہت کم سنی سے فوجی اور ملکی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں تاکہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے تجربہ حاصل کرلے۔

اس ہیئت اجتماعی میں اتحاد پیدا کرنے والا اسلام تھا ہر مرد کے لئے جو اس میں داخل ہوتا تھا یہ شرط تھی کہ پہلے مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کر چکا ہو۔ مگر ریاست کا ایک معین اور مجرد نصب العین بھی موجود تھا جو "سلطنت ابد مدت" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ریاست کے تصور میں عثمانیوں نے ایک باطنی رنگ بھی پیدا کر دیا تھا۔ یہ ویسا ہی عظیم الشان تصور تھا جیسا رومیوں کے یہاں "ابدی رومہ"۔ پانسو سال تک "سلطنت ابد مدت" کے مجرد تصور نے ترکوں میں رومیوں کا سا نظم وضبط قائم رکھا اور وہ اس کی اطاعت اور خدمت میں رومیوں کے برابر بلکہ ان سے بڑھ کر سرگرمی دکھاتے رہے

ریاست سے اس طرح کا تعلق پیدا کرنے کے لئے، جو مذہبی عقیدت تک پہنچ جاتا ہے فرد کو خاندانی رشتوں سے، قدیم رسوم وروایات کی بندشوں سے، غرض ان سب چیزوں سے آزاد رکھنے کی ضرورت تھی جو اسے کسی خاص معاشرتی ماحول سے وابستہ کرتی ہوں۔

وہ ان جسمانی اور روحانی صفات کی تربیت پانے کے بعد، جو اس طبقے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں، اس کا پابند ہو جاتا تھا کہ اس طبقے کے دائرے کے باہر قدم نہ رکھے، چنانچہ اس طبقے کے معمولی اراکین کو نہ تو گھر بسانے کی اجازت تھی نہ شادی کرنے کی۔ اس کے ضابطے رہبانیت کی زندگی سے سختی میں کم نہ تھے۔

اس طبقے میں اسیران جنگ اور عیسائیوں کے لڑکے بھرتی کئے جاتے تھے۔ عمر کی حد بارہ سے بیس تک تھی عیسائیوں کے انتخاب میں ممکن ہے کہ اشاعت مذہب کے جذبے کو بھی دخل ہو مگر اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ بچہ اپنے ماحول سے بالکل الگ کیا جا سکے۔ ہر خطے سے لڑکوں کی ایک مقررہ تعداد لی جاتی تھی۔ بھرتی کرنے والا افسر اپنے حلقے کے گاؤں یا شہر میں جاتا، آبادی کے رجسٹر کا معائنہ کرتا، سب لڑکوں کو جمع کرکے ان کے جسم اور صورت کو دیکھتا، اور ان میں سے چند کو جن کا بدن اچھا ہوتا اور جو دیکھنے میں سمجھ دار معلوم ہوتے منتخب کر لیتا۔ اسی کو مغربی مورخین "خون کا خراج" کہتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں جبر سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو خوشی سے حوالہ کر دیتے تھے۔ مسلمان جو اس حق سے محروم تھے اکثر اپنے ہمسایہ عیسائیوں کو کچھ دے دلا کر اس پر آمادہ کرتے تھے کہ ان کے لڑکے کو عیسائی کہہ کر بھرتی کرا دیں۔ ان سے ہر بچہ سپہ سالار، گورنر بلکہ وزیر اعظم بن سکتا تھا۔ یہ بچے محل کے مدرسے میں داخل کئے جاتے تھے اور ان کی تعلیم بڑی سختی سے ہوتی تھی۔ جسمانی تربیت زیادہ تر اسپارٹا کے یونانیوں کے نمونے پر ہوتی تھی۔ اور ذہنی تعلیم

میں یونانی، رومی، عربی، فارسی، ترکی زبانیں اور تمام مروجہ علوم اور موسیقی شامل تھی ہر لڑکے کو کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھنا پڑتی تھی اور اس سے شاہی خاندان کے لڑکے بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ یہ نظام تعلیم افلاطون کی ریاست کے نظریہ تعلیم سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ قریب ہونا ممکن نہیں۔

دائرہ (ب) تمام ملت اسلامی کو ظاہر کرتا ہے جس میں مسلم ترک، کرد، عرب، البانی وغیرہ شامل تھے۔ ملتون کی تقسیم مذہب کے لحاظ سے تھی۔ ایک ہی مذہب کے لوگ جو ایک منظم کلیسا یا مذہبی ادارے کے ماتحت ہوں ایک ملت سمجھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ تقسیم کچھ تو یہ تھی کہ اسلام نسل و مذہب کے امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا اور کچھ یہ کہ اور کوئی صورت تقسیم کی ممکن ہی نہ تھی۔ گو ملت اسلامی کا مذہب وہی تھا جو حکمران عثمانی طبقے کا مگر وہ اس طبقے کے دائرے سے اسی طرح باہر تھی جیسے اور تمام ملتیں۔

(ب ۱) قدیم عیسائیت یعنی یونانی کلیسا کو ظاہر کرتا ہے جس میں یونانی، سلافی وغیرہ داخل تھے انھیں پوری مذہبی، تمدنی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ بطریق قسطنطنیہ اس ملت کا باضابطہ سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد سے اس ملت کو اور تمام ملتوں سے زیادہ حقوق حاصل تھے۔ مقدونیہ کے عیسائی جنھیں بڑی حد تک سیاسی آزادی حاصل تھی، یونانی گورنروں کے ماتحت رکھے جاتے تھے۔

(ب ۲) اگرجی اور ارمنی۔

(ب ۳) یہودی وغیرہ۔

یہ سب یکساں مذہبی، تمدنی، معاشرتی آزادی رکھتے تھے۔
اپنی ملت کے دائرے سے باہر سیاسی فرائض کی ادائگی میں ان لوگوں کو ان دو طبقوں سے سابقہ پڑتا تھا جو خطوط (ج) و (د) سے ظاہر کئے گئے ہیں۔

ان میں سے (ج) سے مراد علمائے اسلام ہیں جن کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا۔ یہ ایک بہت قوی اور با اثر طبقہ تھا۔ جس کی خاص تربیت ہوتی تھی۔ اس کا اصل فرض یہ تھا کہ ملت اسلامی کے مذہبی اور قانونی معاملات کی نگرانی کرے۔ مگر اس کے علاوہ سلطان کے استبداد کو حد اعتدال کے اندر رکھنے کے لئے وہ ایک اخلاقی قوت کا بھی کام دیتا تھا۔ صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جسے سلطان کے معزول کرنے کا اختیار تھا۔ بغیر اس کی منظوری کے کوئی نیا قانون نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ تمام ملتوں کی طرف سے خواہ وہ مسلماں ہوں یا عیسائی سلطنت کے مقابلے میں رعایا کے حقوق کی حمایت اور حفاظت کرتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر جبری تبدیل مذہب کی سختی سے مخالفت کی۔

(د) فوجی اور ملکی ملازموں کے طبقے کو ظاہر کرتا ہے جو دائرہ (الف) کے اندر شامل ہے۔ یہ وہ نقشہ ہے جس میں ایک طرف تو پورا دائرہ کامل سیاسی استبداد کی تصویر پیش کرتا ہے اور دوسری طرف اندرونی دائرے ملتوں کی روحانی، تمدنی، معاشرتی آزادی کا منظر دکھاتے ہیں۔

سلطان سلیم نے جو سلطان محمد فاتح کا پوتا تھا سب سے پہلے سلطنت عثمانی کی اندرونی کمزوری کو محسوس کیا۔ اس نے دیکھا کہ یہاں مختلف قومیں آباد ہیں جس میں عیسائی

قوم تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ وہ پہلا سلطان ہے جس نے اپنی سیاست کا رُخ مغرب سے مشرق کی طرف یعنی مسلمان سلطنتوں کی طرف کر دیا جنگ ایران کے زمانے میں اس نے جو ظالمانہ سلوک شیعوں کے ساتھ کیا اس میں اس کی فطری بے رحمی کو بھی دخل تھا مگر اس کی یہ مہم عالم اسلام کے متحد کرنے کی کوشش ضرور تھی۔

تبریز کو فتح کرنے کے بعد اس نے مصر اور شام پر لشکر کشی کی اور کل عرب ریاستوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا جس کی وجہ سے ترکی سلطنت میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی عثمانی فتوحات کا رُخ دفعتہً بدل جانے کو لوگ عالمگیر اسلامی اتحاد کی تحریک کا آغاز سمجھتے ہیں ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ مگر میرے خیال میں تو اس کی سب سے بڑی وجہ سلطنت کے استحکام کی خواہش تھی جو عثمانی حکمرانوں کے دل میں فطری طور پر موجود تھی اور سلطان سلیم کا اصل مدعا اس دائرے میں جس کا نقشہ اوپر دکھایا گیا ہے توازن پیدا کرنا تھا۔

اسلامی تاریخ میں ترکی کی خلافت کا مسئلہ اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے جب سلطان سلیم نے مصر فتح کیا اس زمانے میں موجودہ خلیفہ وہیں رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے دنیاوی قوت نکل چکی تھی۔ اور اس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ جب مصر کے بادشاہ تخت پر بیٹھیں تو اس سے دعائے خیر کے طالب ہوں۔ مشہور ہے کہ سلطان سلیم خلیفہ کو استنبول لے آیا اور اس سے منصب خلافت حاصل کیا۔ اس مسئلے کو کسی قدر وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

سلیم کی فتوحات کی پہلی تاریخی دستاویز وہ فتح نامہ ہے جو اس نے وینس اور

ایران بھیجا (۱۵۱۶ء)۔ اس میں خلافت کے مسئلے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اگر سلطان سلیم کا سا شخص خلیفہ بننا چاہتا تو میرے خیال میں وہ ساری دنیا میں اس کا ڈنکا بجا دیتا۔ دوسری تاریخی دستاویز حسن طولون کی کتاب "فتوحات مصر" ہے۔ اس کے مصنف نے سلیم کی فتح مصر کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھے ہیں۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے جو برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر عدنان اس کتب خانے میں تاریخی تحقیقات میں مصروف تھے انھیں یہ چیز ہاتھ آگئی۔ حسن طولون نے اس مہم کے تمام مدارج اور سلطان کے قیام مصر کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن خلافت کے مسئلے کا صرف ایک جگہ اختصار سے ذکر کرو یا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان نے مصر کے علما سے استفتا کیا کہ ایک مسلمان فرمانروا کے لئے بے خلیفہ کی منظوری کے تخت پر بیٹھنا جائز ہے یا نہیں انھوں نے فتوے دیا کہ جائز ہے۔ اس لئے سلطان نے اس گفتگو کو ختم کر دیا اور وہ خلیفہ سے ملنے کے لئے نہیں گیا۔

شاید خلیفہ کا استنبول لانا بھی محض افسانہ ہے۔ اس زمانے کے مورخوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ اگر خلیفۂ اسلام استنبول میں آکر رہتا اور وہیں وفات پاتا تو اس کے مسکن اور مرقد کا تو پتہ ہوتا۔ مگر اس کے متعلق کوئی روایات تک موجود نہیں۔ بہر حال ترکی تاریخ میں خلیفہ اور خلافت کا ذکر نہیں آتا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم اور اس کے بعد کے سلاطین نے مدت تک خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ اصل میں خلافت کا چرچا تو عبدالحمید ثانی کے زمانے میں شروع ہوا۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان سلیم سچا مسلمان اور اسلام کی عظمت کا دل سے قائل تھا۔ جب وہ حلب میں تھا تو شریف مکہ نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کعبے کی کنجیاں بھیجیں۔ مسجد میں خطیب نے پہلی بار سلیم کے نام کے ساتھ صاحب الحرمین الشریفین کے الفاظ کہے۔ سلیم نے کہا میں صاحب الحرمین نہیں بلکہ خادم الحرمین ہوں۔ اس روز سے سلاطین ترکی کے القاب کا ایک نہایت اہم جز خادم الحرمین الشریفین ہو گیا۔ خود سلیم اسے بے انتہا اہمیت دیتا تھا۔ جب مصر میں خطیب نے پہلی بار اس کے نام کے ساتھ یہ لقب پکارا تو سلیم نے جانماز کو ہٹا کر فرش مسجد پر سجدہ کیا۔ اس رقت قلب کی قدر تب معلوم ہو گی۔ جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ ترکی سلاطین عموماً کتنے خوددار ہوتے تھے اور خصوصاً سلیم کس قدر سخت طبیعت کا آدمی تھا۔

جب سلطان سلیم اس مہم سے واپس آیا تو اس نے چاہا کہ اپنی سلطنت کے کل عیسائیوں کو خواہ تبلیغ کے ذریعے خواہ جبر سے کام لے کر مسلمان کرے اور اپنی قلمرو میں ترکی زبان رائج کرے۔

شیخ الاسلام جمالی آفندی نے اس کی مخالفت کی۔ اتنا بڑا کام بغیر شرعی فتوے کے کیا نہیں جا سکتا تھا اور فتوے دینے سے شیخ الاسلام نے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ سلطان محمد فاتح نے رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی ہے۔ سلطان کو ان کے حقوق کے بارے میں شبہ تھا۔ شیخ الاسلام نے تین بڈھے ینی چری جن کی عمر سو سو سال سے بھی زیادہ تھی گواہ کے طور پر پیش کئے۔ یہ تینوں سلطان محمد فاتح کے جھنڈے کے نیچے

لڑ چکے تھے اور انھوں نے یہ شہادت دی کہ واقعی یہ حقوق عطا کئے گئے تھے۔ سلطان سلیم کو یہ خیال ترک کر دینا پڑا کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کرکے سلطنت میں اتحاد پیدا کرے۔

یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ سلیم کا سا شخص جس نے خدا جانے کتنے وزیروں کو قتل کرا دیا، شیخ الاسلام کے آگے جو قانون اور شریعت کا نمائندہ ہے سر جھکا دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک سلطنت عثمانی کا نظام اور اس کے اصول بڑے سے بڑے سلطان کی شخصیت سے زیادہ قوی تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جمالی آفندی اور تینوں بوڑھے سپاہیوں میں عثمانی قومیت کا احساس اس حد تک موجود تھا کہ گو وہ دل سے چاہتے ہوں کہ سارا ملک مسلمان ہو جائے مگر انھوں نے اپنی سلطنت کے اصول کی حمایت فرض سمجھی۔

سلطان سلیم کے بعد ساری سلطنت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کی تحریک ختم ہو گئی اس کے بیٹے سلیمان اعظم نے پھر اپنی فوجوں کا رُخ مغرب کی طرف پھیر دیا اور وائنا تک پہنچ گیا۔ عثمانی سلطنت ۱۲۹۹ء میں قائم ہوئی تھی اس کے عروج کا زمانہ ۱۷۷۴ء (صلح نامہ کوچک قنارجہ) تک رہا۔ اندرونی کمزوری اس سے پہلے پیدا ہو چکی ہو گی مگر ۱۷۷۴ء سے زوال کے آثار صاف ظاہر ہونے لگے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال تک یہ سلطنت بڑی بہادری سے اپنے دشمنوں کی فوجوں کا مقابلہ کرتی رہی جو تعداد اور ساز و سامان میں اس سے بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔



ابھی تک سلطنتِ عثمانی کی کوئی تاریخ تنقیدی اور تعمیری اصول پر نہیں لکھی گئی اگرچہ مسالے کی کمی نہیں ہے۔ سرکاری کاغذات اور افراد کی شہادتیں بہت کثرت سے موجود ہیں۔ جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بعض صرف واقعات کی کھتونی ہیں اور باقی سب میں بیجا تعصب اور طرف داری سے کام لیا گیا ہے اور سوائے اس کے کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جب تک یہ سلطنت قائم تھی اس نے اپنی مخالفت اور موافقت میں ایسا شدید ہنگامہ جذبات پیدا کر رکھا تھا کہ مشرق یا مغرب کا کوئی مورخ بھی اس کی بے لاگ مجموعی تاریخ نہیں لکھ سکتا تھا۔ البتہ اس کے مختلف اجزا پر اچھی اچھی کتابیں قابل مصنفوں کے قلم سے موجود ہیں۔

اب عثمانی سلطنت فنا ہو چکی ہے۔ اور اس سے کسی کو فائدہ یا ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ جو مورخ یا مورخوں کی جماعت چاہے انصاف کی نظر سے اس کی تاریخ کا مطالعہ کر سکتی ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس کام کو ایک جماعت اپنے ہاتھ میں لے کیونکہ ایک فردِ واحد اس عظیم الشان منصوبے کو پورا نہیں کر سکتا۔ بہر حال اس وقت تو میں جو اپنی ابتدائی عمر میں اس سلطنت کو دم توڑتے دیکھ چکی ہوں اس کی اجازت چاہتی ہوں کہ اس کے متعلق چند خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

خواتین اور حضرات!

میرے نزدیک عثمانیوں کے نظریہ سلطنت کی حقیقی اہمیت یہ نہیں ہے کہ انہوں نے

مختلف عناصر کو متحد اور متضاد اصولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا بلکہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ نظریہ پھر سے اختیار کیا جا رہا ہے۔

مشرق اور مغرب دونوں جگہ انسانی معاشرت میں نشوونما ہوتی رہی ہے۔ مشرق کی انتہا سے زیادہ استبداد پسند حکومت نے بھی انسان کے جسم کو غلام بنایا ہو مگر اس کی روح پر کبھی جبر نہیں کیا۔ مغرب نے حکومتوں نے روح کو بھی آزاد نہیں چھوڑا۔ فرد کو عقیدے اور خیال کی آزادی حاصل کرنے کے لئے جو جدوجہد کرنا پڑی وہ انسانی تاریخ میں بڑے معرکے کا افسانہ ہے۔ اس جدوجہد سے قطع نظر کرکے اور بعض صورتوں میں اسی کی وجہ سے مغرب میں حکومتیں خصوصاً قومی حکومتیں تدریجی نشوونما کے ذریعے قائم ہوئیں

مگر دوسری طرف سیاسی، معاشرتی، یا معاشی مصیبت اور انتشار کے زمانے میں مغرب میں کبھی کبھی ریاست کے نئے منصوبے اور نقشے بھی بنتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کمزور بوڑھے آدمی نے بنایا تھا جو برٹش میوزیم میں گرد سے اٹی ہوئی کتابوں کے درمیان بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ اس کی تصنیف آج دنیا میں (DAS KAPITAL) کے نام سے مشہور ہے۔ مگر کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ منصوبے قوموں کی زندگی میں عمل میں لائے جا سکتے ہیں

مگر جنگ کے بعد کچھ اور ہی رنگ ہو گیا۔ آج مغرب میں جہاں دیکھئے ڈکٹیٹر (مختار کل) نظر آتے ہیں جو اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ قوموں کی زندگی کی تشکیل از سرِ نو کسی

منصوبے کے مطابق کریں۔ گو ان کے اصول و مقاصد میں فرق ہے مگر ان کا نظم حکومت اور طرزِ عمل سب کہیں یکساں ہے۔ اس نظریے اور عمل کی پہلی مثال عثمانی ترکوں نے قائم کی تھی اس طرح کی حکومتوں میں روس کی اشتراکی حکومت بعض امور کے لحاظ سے عثمانی سلطنت سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

عثمانی سلطنت اور اشتراکی روس کا مقابلہ اشتراکی بانیان سلطنت مختلف نسل کے ہیں انھوں نے نسل اور نسب کے امتیاز کو بالکل مٹادیا ہے۔ اشتراکی حکمراں طبقے میں ہر قوم کا شخص شامل ہوسکتا ہے بہ شرطیکہ وہ اشتراکی عقیدے پر بے چون و چرا ایمان لے آئے یہی حال عثمانیوں کا تھا۔ ان کے حکمراں طبقے میں شامل ہونے کے لئے صرف مذہب اسلام کا پیرو ہونے اور سلطنت عثمانیہ سے عقیدت اور محبت رکھنے کی شرط تھی۔ عثمانیوں نے مشرق وسطیٰ میں منظم سلطنت قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اشتراکی روس نے ساری دنیا کے بھوکوں کا پیٹ بھرنے اور معاشی عدم مساوات کو دور کرنے کا ذمہ لیا ہے۔

حکمراں طبقے کے انتخاب اور تربیت کے مقابلے میں اشتراکی روس اور عثمانی سلطنت میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔

پہلا اصول عثمانیوں کے یہاں یہ تھا کہ حکمرانوں کے انتخاب میں نسل اور نسب کا خیال نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ انتخاب کم سنی میں کیا جائے۔ تیسرا یہ کہ جن لوگوں کا انتخاب کیا جائے وہ ملک کے عام ماحول اور معاشرت سے بالکل علیحدہ رکھے جائیں تاکہ قدیم روایات کا ان پر کوئی اثر نہ پڑنے پائے۔ یہی صورت سوویٹ روس میں ہے اشتراکی نوجوانوں کی تعلیم

کے مرکز ترکی مدرسہ سرائے اور ینی چری کیمپ کے نمونے پر قائم ہوئے ہیں۔ ان دونوں تعلیمی کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں ایک نئی ذہنیت پیدا کی جائے جو ریاست کی مصلحت کے مطابق ہو۔ فرق اتنا ہے کہ عثمانیوں کے یہاں یہ تربیت صرف حکمراں طبقے تک محدود تھی اور سوویٹ روس کا مقصد یہ ہے کہ سب انسانوں کی تربیت اسی نمونے پر ہو۔ حکومت کے نقطہ نظر سے دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ اشتراکیوں کا ملکی اور فوجی طبقہ خاص تربیت حاصل کرکے سوویٹ روس پر اسی طرح حکومت کرتا ہے جس طرح عثمانیوں کا تربیت یافتہ حکمراں طبقہ عثمانی سلطنت پر کرتا تھا۔ رفیق اسٹالین کے اختیارات سلیم سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں دونوں اپنے ملک کے جتنے لوگوں کو چاہتے قید اور قتل کرسکتے تھے اور انھوں نے کیا بھی۔ مگر ریاست کی بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کا حق نہ سلیم کو تھا نہ اسٹالین کو ہے۔ عثمانی سلطنت میں تو اس کی روشن مثال یہ ہے کہ سلیم اپنی رعایا کو بزور شمشیر مسلمان کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کرسکا کیونکہ فرد کو ذہنی آزادی عطا کرنا سلطنت عثمانیہ کا ایک بنیادی اصول تھا اس طرح اگر اسٹالین چاہے کہ ذاتی ملکیت کا حق لوگوں کو پھر سے دے دے تو نہیں دے سکتا گو روس کی کثرت کی بھی یہی خواہش ہو۔ اس لئے کہ اشتراکی سلطنت کے اصول کے خلاف ہے۔

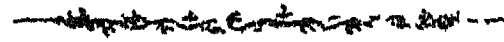
عثمانی سلطنت اور سوویٹ سلطنت میں سب سے بڑا فرق مقاصد کے لحاظ سے ہے۔ پھر یہ کہ سوویٹ کا دائرہ عمل وسیع تر اور اس کی کارکردگی بہتر ہے اس لئے کہ اس کے پاس جدید سائنس کے تمام وسائل موجود ہیں مگر دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ نظام حکومت ایک خاص طبقے کی طرف سے عام لوگوں پر عائد کیا جاتا ہے اور اس طبقے کی مخصوص

تربیت ہوتی ہو۔ یہ۔ وہ پیسر آرنلڈ ٹوائنبی نے اپنی "علم تاریخ" میں جو فلسفہ تاریخ کی ایک جدید کتاب ہو کہا ہو کہ عثمانی سلطنت کا نظام انسانی فطرت کے منافی تھا مجھے اس سے اتفاق ہے اور میں بھی اسے کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی عثمانیوں نے حکمراں طبقے کی روح کی تشکیل اس طرح کرنا چاہی جیسے مشین کا آدمی بنایا جاتا ہے مگر میری اور میرے ہمعصروں کی رائے کیا چیز ہے۔ مغرب میں ایسی ریاستیں پیدا ہو گئیں ہیں جو نہ صرف حکمران طبقے کو بلکہ پوری قوم کو مشین میں ڈھالنا چاہتی ہیں اور علم و حکمت کی دنیا میں ان کی تائید کرنے والے موجود ہیں۔ برٹرانڈ رسل اور ایچ۔ جی۔

ویلس ... ... یہ سب لوگ انسانی معاشرت کو ایک مقررہ سانچے میں ڈھالنے کے قائل ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کل صرف صناع (آرٹسٹ) معاشرت کی جبری تنظیم کے مخالف اور فرد کی آزادی کے حامی رہ گئے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آلڈوس ہکسلے جو ایک صناع ہے اپنی کتاب "بہادروں کی نئی دنیا" میں منظم معاشرت کی ایک تصویر پیش کرتا ہے اور اس معاشرت میں نہ صناعی کو کہیں جگہ دی گئی ہے۔ نہ عہد ماضی سے کوئی تعلق قائم رکھا گیا ہے۔

غرض آج دنیا ایک کشمکش میں مبتلا ہے ریاست کی جبری تنظیم کا خیال اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور معاشرت کی فطری نشو و نما کا تصور اپنی طرف۔ ایک محدود رقبے کے اندر ریاست کی جبری تنظیم کو پہلی بار عمل میں لانے والے عثمانی ترک تھے۔ اس لئے جو لوگ جبری تنظیم کے نظریے کے قائل ہیں ان کے لئے عثمانی سلطنت کا نظام خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ مگر معاشرت کی آزاد فطری نشو و نما کے حامیوں کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اس لئے کہ عثمانیوں نے اس جبر کے باوجود رعایا کے تمام فرقوں کو معاشرتی نشو و نما کی

آزادی دے رکھی تھی۔ عثمانی سلطنت کی تاریخ میں مشرق اور مغرب کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غلبہ مشرقی رنگ کو حاصل تھا۔ عثمانیوں کا روحانی آزادی کے حق کو تسلیم کرنا اور اسے ناقابل دست اندازی سمجھنا محض اسلام کی برکت تھی



دوسرا خطبہ

عثمانیوں کا زوال

انسانی زندگی میں دو ایسے واقعات ہیں جن کا بالکل ٹھیک وقت ہم نہیں بتا سکتے ان میں سے ایک جس کا تعلق فرد کی زندگی سے ہے نیند آنا ہے۔ کوئی شخص آج تک اس خاص لمحے کا تعین نہیں کر سکا جب جاگنے والا سو جاتا ہے۔ دوسرا واقعہ جس کا تعلق قومی زندگی سے ہے تنزل یا زوال ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا سب کو اس کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ چکتا ہے۔

انسان نے دن کو کتنا ہی خوش گوار کام کیا ہو وہ رات کو سونے پر مجبور ہے تا کہ دن بھر کی تکان دور ہو جائے وہ صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھے اور پھر اپنے کام میں لگ جائے۔ اسی طرح کسی قوم کی تہذیب اور ریاست کتنی ہی عظیم الشان اور مستحکم کیوں نہ ہو اس کے بانیوں کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ زوال کا زمانہ قوموں کے لئے استراحت کا زمانہ ہوتا ہے جتنا فرد کے لئے ایک دن ہے اتنا قوم کے لئے ایک دور ہوتا ہے رومی سلطنت کے زوال کا دور مغرب کے لئے آرام کا زمانہ تھا۔ اس کے گزرنے کے بعد نئی قومیں اٹھ کھڑی ہوئیں

اور انھوں نے نئے تمدن بنا ڈالے۔ قدیم مشرقی تمدنوں کے گھر، چین، ہندوستان اور مشرق ادنی بھی اب وہی سماں دکھا رہے ہیں ان کے رہنے والے جو مدت سے سو رہے تھے آج انگڑائیاں لیتے نظر آتے ہیں

زوال کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ قوم کو اپنا آہنگ حیات اپنی زندگی کی رَو بدلنے کے لئے وقفہ مل جاتا ہے۔ ادھر حکومت اور ریاست کی عمارت بیٹھتی ہے، تہذیب اور تمدن کا شیرازہ بکھرتا ہے اور ادھر زندگی کے معیار تبدیل ہوتے ہیں اور قومیں غیر شعوری طور پر ایک نئے تمدن اور نئی زندگی کی تیاری کرتی ہیں

عثمانی سلطنت کے زوال کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی۔ کوتاہ نظر مورخ یہ دیکھ کر کہ ۱۵۷۱ء میں عثمانی فوج کو بڑی زبردست شکست اور ذلت اٹھانی پڑی اسی کو زوال کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جن اسباب کی وجہ سے یہ مصیبت آئی وہ سلطنت ابدمدت میں پہلے سے جمع ہو رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ زوال ساری سلطنت پر ایک ساتھ آیا بھی نہیں۔ جو چیز ایک عنصر کے تنزل کا باعث تھی وہ دوسرے کے لئے موجب ترقی ہوگئی۔ اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہم اس نقشے سے کام لیتے ہیں جو صفحہ ۹۰ پر درج ہے

ہم مرکز (الف) یعنی حکمراں طبقے اور اداراتِ حکومت سے ابتدا کرتے ہیں۔

عثمانی شاہی خاندان میں غیر معمولی قابلیت کے حکمراں اتنے پیدا ہوئے کہ اور کسی خاندان میں نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔ انھیں بہت عمدہ تعلیم اور فوجی اور ملکی خدمت کی تربیت دی جاتی تھی ان خدمات کو عملی طور پہ انجام دے کر وہ اس قوم کے متعلق جس پر حکومت

کرنے والے تھے۔ بلاواسطہ معلومات اور تجربہ حاصل کرتے تھے۔ اگر کوئی سلطان غیر معمولی دماغ کا ہوتا تو وہ اس ترتیب کی بدولت دنیا کے حکمرانوں کی صفِ اول میں جگہ پاتا تھا لیکن اگر معمولی دماغ کا ہوتا تب بھی نظامِ حکومت کو اچھی طرح چلا لیتا تھا۔

یہ مسلّم ہے کہ سلطنت عثمانیہ کا منتہائے عروج سلیمان اعظم کا زمانہ تھا۔ وہ تین اقلیموں پر حکومت کرتا تھا اور صرف یورپ میں اس کے مقبوضات وی آنا کے قریب تک پہنچ گئے تھے بڑی بڑی سلطنتیں اسے اپنا دوست بنانے کی کوشش کرتی تھیں اور اس کی فوج مغربی ممالک کی متحدہ افواج کو بحری اور بری جنگ میں شکست دیتی تھی۔

مگر سلیمان اعظم پر اس کی بیوی خرم سلطان کی حکومت تھی جو روسی نسل سے تھی اور مغربی تاریخ میں روزالین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عورت تھی جس کے بال سرخ تھے اور ناک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی وہ غضب کی تیز مزاج تھی اور سازش کرنے میں تو اٹلی کے میڈیچی خاندان کی تمام عورتیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ خرم سلطان کا ایک لڑکا تھا بدوضع، بدچلن، شراب خوار جسے وہ سلیمان اعظم کے بعد تخت شاہی پر بٹھانا چاہتی تھی مگر ولیعہد سلطنت شہزادہ مصطفٰے تھا جس کی ماں خرم سلطان سے پہلے سلیمان کے نکاح میں آچکی تھی یہ شہزادہ اعلیٰ درجے کی فوجی اور انتظامی قابلیت رکھتا تھا۔ خرم سلطان نے جس طرح سلطان سلیمان کو اس سے برگشتہ کیا جس ترکیب سے اسے قتل کرایا اس کی تفصیل کی گنجائش تاریخ میں نہیں بلکہ اس کے لئے ایک ڈراما کی ضرورت ہے آخر وہ اپنے بیٹے کو ولی عہد بنوا کر مانی۔

اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو کچھ ایسا حرج نہ تھا اس لئے کہ سلطنت کی قوت اور استحکام کا مدار زیادہ تر اس کے مکمل نظام پر تھا اور اکثر سلطانوں کی نالائقی کی تلافی ارکین سلطنت کی قابلیت اور تدبر سے ہو جاتی تھی۔ مگر حرم سلطان نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ سلیمان اعظم کو اس پر آمادہ کیا کہ شہزادوں کو محل میں قید رکھ کر تعلیم دی جائے۔ یہیں سے شاہی خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے شہزادوں کی تعلیم کے نصاب سے جسمانی تربیت اور عملی تجربے کے اجزا خارج کر دیئے گئے۔ قدیم زبانوں کی اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم انھیں اب بھی دی جاتی تھی مگر اب وہ تخت نشینی کے وقت تک قصر شاہی کے باہر قدم نہیں رکھنے پاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اب بادشاہ ایسے لوگ ہونے لگے جو بسم اللہ کے گنبد میں پلتے تھے، عیش و آرام کے عادی ہوتے تھے، اور اپنی سلطنت کے حالات سے بالکل ناواقف۔

سترھویں صدی میں اول سے آخر تک برے سلطانوں کا ایک سلسلہ بندھا رہا ان میں جو عیش پسند نہیں تھے وہ حد سے زیادہ ظالم تھے اور جو حرم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ انتہا سے زیادہ بداطوار۔ ان کی منظور نظر بیگمیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے فروخت کرنے لگیں۔ ہماری زبان میں مثل ہے "مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے" ملکی عمال بھی سلطانوں کے قدم بقدم چلنے لگے اور رشوت دے کر اعلیٰ عہدے پانا ایک معمولی بات ہو گئی۔ اب تک قابلیت ترقی کا معیار تھی۔ اب اس کی کوئی قیمت نہ رہی غرض سلاطین عثمانی جو اب تک قدیم رومی شہنشاہوں کی طرح مردانگی کے جوہر رکھتے تھے بازنطینی حکمرانوں کی طرح آرام طلب اور عیش پرست ہونے لگے۔ اس زمانے کا عثمانی قصر شاہی بازنطین کے

شاہی محل کا جواب تھا۔ بہت کم سلطان ایسے ہوں گے جو طبعی موت سے مرے ہوں کیونکہ اس صدی میں فوجوں کی بغاوت اور فرمانرواؤں کی معزولی کا بازار گرم تھا اور وہ اکثر قتل بھی کر دیئے جاتے تھے

فوج، جو نقشے میں خط ردہ سے ظاہر کی گئی ہے عثمانی نظام سلطنت کی جان تھی اس کا انحطاط گویا موت کا پیغام تھا کوچی نے سترھویں صدی میں سلطان مراد کے سامنے اصلاحات کی ایک تجویز پیش کی اس کی بنا پر جو تبدیلیاں کی گئیں انہیں سے فوج کے تنزل کا آغاز ہوا

بھرتی کا پرانا طریقہ جس میں انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جاتا تھا ترک کر دیا گیا بجائے اس کے کہ سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد تمام قوموں سے لی جائے اب صرف مسلمان ہی لئے جانے لگے اس کے علاوہ تقرر اور ترقی میں سفارش اور رعایت چلنے لگی۔ فوج میں علاوہ ان لوگوں کے جو واقعی کام کرتے تھے بہت سے ایسے لوگ داخل ہو گئے جو صرف تنخواہ پانے کے لئے نام لکھوا لیتے تھے اور باضابطہ دستے میں شامل نہ تھے۔ پھر یہ کہ ہر طبقے اور حیثیت کے لوگ ینی چری فوج میں گھسنے لگے یہاں تک کہ ایک فرانسیسی قنصل اور ایک بطریق نے بھی اپنا نام اس میں درج کرا لیا بطریق کا قصہ یہ ہے کہ چند معزز آرمینیوں نے وزیر اعظم سے شکایت کی کہ ہمارا بطریق چھپا ہوا رومن کیتھولک ہے اسے عبور دریائے سور کی سزا ملنی چاہیئے بطریق کو اس کی خبر لگ گئی اور اس نے اپنا نام ینی چری فوج کی ایک جماعت میں لکھوا لیا جس کا سردار اس کا دوست تھا۔ ایک اتوار کو اس گرجا میں

جہاں بطریق نماز پڑھا رہا تھا دو مبی چری دستے پہنچے۔ایک اسے گرفتار کرنے کے لئے آیا تھا اور دوسرا اسے بچانے کے لئے۔ جب پہلے دستے کے افسر کو معلوم ہوا کہ بطریق مینی چری ہے تو اس نے فوجی سلام کیا اور اپنے سپاہیوں کو لے کر چلا گیا یہ ویسی ہی بات ہے جیسے آج کل کوئی شخص ان ملکوں میں جہاں مختار کل کی حکومت ہے اپنی جان بچانے یا خاص حقوق حاصل کرنے کے لئے اشتراکی پارٹی یا کسی اور پارٹی میں جو حکمراں ہو کسی رعب سے گھس جائے۔

فوجی جماعت کی راہبانہ زندگی بھی ختم ہوگئی۔ مینی چری اب شادی کرنے لگے انھیں دنیا کے معاملات سے تعلق اور دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ریاست سے جو باطنی والہانہ عقیدت لوگوں کو تھی وہ کم ہونے لگی اگرچہ کبھی کبھی حکمراں طبقہ ایسا حیرت انگیز نظم و ضبط دکھاتا تھا جو واقعی عثمانیوں اور رومیوں ہی کا حصہ تھا۔ اصل میں یہ پرانی روایات کا رہا سہا زور تھا جو اس کام دے رہا تھا ورنہ سلطانوں کی بداعمالی اور ان کے ظلم و جور نے جس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، تمام نظم و ضبط کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لعض اوقات شورش اس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ تقریباً ہر مہینے فوج سلطان کی کسی نہ کسی بدعنوانی کے خلاف احتجاج کے طور پر بغاوت کیا کرتی تھی۔ اور ایسا تو شاید ہی کوئی سال گزرا ہو جس میں فوج نے کم سے کم دو بار شوربے کی دیگ نہ الٹی ہو (یہ بغاوت کی علامت تھی) اس سے سلطانوں کے مظالم کی روک ہونا چاہیئے تھی مگر نہیں ہوئی۔ فوج کو بغاوت کی عادت پڑ گئی اور چونکہ محل کے اندر اور باہر کی ہر سازش میں فوج سے مدد لی جاتی تھی اس لئے سیاسی معاملات

کی کنجی فوج کے ہاتھ میں آ گئی۔

علما کا طبقہ بھی، جو مذہب اور قانون کا حامل تھا (دیکھو نقشے میں خط (7)) اور حکمراں طبقے کے دائرے سے الگ ہونے کے باوجود نظام سلطنت کا ایک نہایت اہم عنصر تھا اس انحطاط سے متاثر ہونے لگا۔ ہم اس کے زوال پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

(۱) اس طبقے کو غیر مسلم ملتوں کی حمایت کا حق عبدالحمید ثانی کے زمانے تک حاصل رہا، نہ صرف سلطان سلیم کے زمانے میں بلکہ سولھویں صدی میں بھی اس نے بہت سے موقعوں پر عیسائیوں کی حمایت کی۔

(۲) سلطان کو معزول کرنے کا حق جو علما کے طبقے کو حاصل تھا ایک مستقل اخلاقی قوت کی حیثیت سے ظلم و استبداد کو روکنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے فوج سے اتحاد عمل کرنا، اور سیاسی امور میں دخل دینا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما کی جماعت اب ایک غیر جانب دار قانونی اور مذہبی جماعت نہیں رہی۔ مذہب بھی بساط سیاست کا ایک مہرہ بن گیا۔

(۳) ملت اسلامی کی تعلیم انھیں علما کے ہاتھ میں تھی۔ جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفے کی حکومت رہی یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ فاتح اس زمانے میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علما کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے

کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اس تک آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرزِ خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظامِ تعلیم پر حاوی رہا ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علما کا یہ طرزِ خیال جذبہ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ فلسفہ کلام یا علم کلام خواہ وہ عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا یونانیوں کے فلسفے پر مبنی ہے اس پر کم و بیش ارسطو کے خیالات کا رنگ غالب ہے جو ایک وثنی فلسفی تھا یہاں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم مختصر الفاظ میں عیسائی علما اور مسلمان علما کے طرزِ خیال کا مقابلہ کریں

قرآن کریم میں عالم طبیعی کی تخلیق کے مسئلے کا کہیں تفصیل سے ذکر نہیں ہے۔ اس کی تعلیم میں زیادہ اہمیت اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو دی گئی ہے اس کا خاص مقصد حسن و قبح خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے وہ دنیا کے لئے ایک قانون عمل لے کر آیا ہے۔ مابعد الطبیعی مسائل اور روحانی معارف بھی جہاں کہیں بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی یا اشکال نہیں ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم توحید ہے۔ یعنی قوت خلاق کی وحدت کو تسلیم کرنا، اللہ کو ایک جاننا۔ اسی وجہ سے اسلام ایک نہایت سہل اور سادہ مذہب ہے، اور اس میں اور مذاہب سے کہیں زیادہ اس کی گنجائش ہے کہ عالم طبیعی کے نئے نظریات کو قبول کر سکے۔ مگر یہ سادگی اور وسعت نظر جو نئی علمی تحقیقات کے لئے اس قدر سازگار تھی مسلمانوں میں زیادہ دن نہیں رہنے پائی۔ چوتھی صدی میں علما اور متکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول و ضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا یعنی تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں اسلامی فلسفے میں ارسطو کے خیالات داخل ہو گئے۔

برخلاف اس کے دینِ عیسوی میں، جسے مسیح کے مذہب کی جگہ سینٹ پال کا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے، کتاب پیدائش کے اندر عالمِ طبیعی کی مفصل تفسیر موجود ہے۔ عیسائی اسے خدا کا کلام تسلیم کر چکے تھے اس لئے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اس تفسیرِ عالم کی حقانیت کو ثابت کریں ۔ تاویل میں مشاہدہ ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اس لئے استدلال سے مدد لینا پڑی ارسطو کا دامن انھوں نے اس لئے پکڑا کہ ان کی منطق سحر کی سی خاصیت رکھتی تھی

جب مغرب نے فطرت کا مطالعہ مشاہدے اور تجربے، تحلیل اور تجربے کے ذریعے سے کرنا شروع کیا تو اربابِ کلیسا کے ہوش اڑ گئے۔ ادھر نئے علمی طریقوں کی مدد سے بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے اور ادھر عیسائی علما کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اب کلیسا کی حکومت کا خاتمہ ہے۔ چنانچہ مغرب میں اس دور کا آغاز ہوا جس میں بڑے بڑے سائنس داں جو عالم طبیعی کے ۔ میں تلاش حق میں مصروف تھے شہید کر دیئے جاتے تھے۔

سائنس اور مذہب کے خونریز معرکوں کے بعد آخر کار کلیسا کو مصلحت شناسی سے کام لینا پڑا۔ اس نے ہیشہ مدرسوں اور کلیساؤں کے نصاب میں سائنس کو داخل کر لیا اس کی یونیورسٹیاں جو پہلے بالکل اسلامی مدارس کی طرح تھیں، سائنس اور علوم جدیدہ کا مرکز بن گئیں مگر اس کے ساتھ اس نے اپنے مابعد الطبیعی فلسفے کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کا اثر تعلیم یافتہ طبقے کے کم از کم ایک حصے پر بدستور باقی رہا کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری نئے علوم پر عبور رکھتے تھے اور نئے زمانے کے نوجوانوں سے ہر موضوع پر بحث کر سکتے تھے۔

عثمانیوں کے یہاں علما کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ اُدھر دورِ انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدے اور تجربے کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی۔ سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفے پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں۔ چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔ اگرچہ ریاست نے ۱۸۶۰ء سے نئے طرز کے ہائی سکول قائم کرنا شروع کئے لیکن طلبہ کی بڑی تعداد اب بھی قدیم مدارس میں تعلیم پاتی رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سترھویں صدی میں عیسائیوں کے فوجی خدمت سے بری ہو جانے کے بعد اب ملک کی حفاظت کا بوجھ صرف مسلمانوں ہی پر رہ گیا تھا اور انھیں قریب قریب ساری عمر فوجی خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔ اس سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ کسی قدیم مدرسے میں داخل ہو جائیں۔ اس لئے ان مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان مدارس میں پناہ لیتی تھی۔ رہے وہ مسلمان نوجوان جو ۱۸۶۰ء کے بعد سے سرکاری مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے ان کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ اسلام کی تعلیم ترقی اور تحقیق میں رکاوٹ ڈالتی ہے اس طرح علما کے مخالفوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے تعصب اور تشدد کا وہی حال تھا جو کسی نئے مذہب کے پیروؤں کا ہوتا ہے۔

سنہ ۱۸۶۹ء سے ریاست نے ابتدائی تعلیم کے مدارس بھی قائم کئے، جن میں جدید نصاب رائج تھا، مگر ان کی تعداد بہت کم تھی اس لئے طلبہ کی کثیر تعداد بدستور مسجدوں کے مکاتب میں پڑھتی رہی۔ چنانچہ عوام کی تعلیم پر بھی وہی جمود طاری رہا اور آگے چل کر جو کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں وہ بجائے اس کے کہ صحیح ارتقا اور نشو و نما کا نتیجہ ہوتیں حکمراں طبقے کی طرف سے زبردستی عائد کی گئیں۔ ان کی نافذ کرنے والی عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو علما کو نہ صرف تعلیم سے بے دخل کرنا چاہتی تھی بلکہ ان کی اخلاقی اور روحانی حکومت کی بیخ کنی کے درپے تھی

تعلیم کا یہ انحطاط میرے خیال میں تمام اسلامی ممالک میں عام تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مذہب اسلام میں تجدید و اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں اور سنوسی، وہابی، بابی فرقے پیدا ہوئے مگر وہ شخص جس نے سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ قدیم تعلیم کو کس حد تک مسلمانوں کے زوال میں دخل ہے، شیخ جمال الدین افغانی تھا۔ وہ افغانستان میں مدتوں تک سختیاں جھیلنے اور مصیبتیں اٹھانے کے بعد اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ترکی آیا اور آتے ہی اس نے اہل علم کو متوجہ کر لیا اس کی کوشش سے تعلیمی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور حکومت نے اسے مجلس تعلیمی کا رکن مقرر کر دیا وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے مجمعوں میں تقریریں کیا کرتا تھا۔ ترکی علما کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ شیخ الاسلام فہمی آفندی نے اس کی تعلیم کو شریعت اسلام کے خلاف قرار دیا سنہ ۱۸۷۰ء میں شیخ جمال الدین نے ہمیروں کے معاشرتی فرائض کے موضوع پر

ایک تقریر کی۔ اس سے مخالفت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ شیخ ترکی سے مصر چلا گیا اور علما اپنے مدرسوں میں وہی پرانے سبق رٹاتے رہے۔

یہ ہے عثمانی نظام سلطنت کے زوال کی تصویر۔ اب رہیں وہ قومیں جو نقشوں میں دائروں کی شکل میں ظاہر کی گئی ہیں ان کی حالت اس زوال کے دور میں مختلف تھی۔

دائرہ (ب) یعنی ملت اسلامی کی تعلیمی حالت ہم دیکھ چکے ہیں۔ دوسرے دائروں یعنی غیر مسلم قوموں میں اس سے بہت بہتر حالت تھی۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ عیسائی قوموں نے اس زمانے میں کوئی بڑی چیز پیدا کی مگر اس میں شک نہیں کہ انھیں زمانے کے بدلنے کا احساس تھا اور انھوں نے دنیاوی امور میں اس سے فائدہ اٹھایا۔ انھیں اس کا موقع اس وجہ سے مل گیا کہ مسلمان خصوصاً ترک قریب قریب ہمیشہ میدان جنگ میں رہے تھے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کی اقتصادی حالت کا تفاوت اور ملک کا عام معاشی انحطاط اس زمانے کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ اس کا مطالعہ ابھی تک بے تعصبی کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ یہ خیال مجھے جو کچھ تاریخی مسالہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

مغربی مورخین کا معاشی انحطاط کے مسئلے کو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ عثمانی قوم میں مسلمان کوئی مفید کام کرنے والے اور دولت پیدا کرنے والے نہیں بلکہ محض صرف کرنے والے تھے واقعات کے خلاف ہے۔

(۱) جب تک زراعت، صنعت، تجارت اور نقل و حمل کا دارومدار سائنس اور مشینوں پر نہیں بلکہ محض ہاتھ کی محنت، تنظیم اور معاملہ فہمی پر رہا سلطنت عثمانی کی معاشی حالت اچھی

ری اور اس کے مختلف عناصر میں توازن اور تقسیم محنت باقی رہی۔

۲۔ عثمانی ترک زیادہ تر کھیتی کرتے تھے یا مویشی وغیرہ پالتے تھے وہ ساری سلطنت کے لئے گیہوں، ترکاریاں، پھل مہیا کرتے تھے اور گوشت کھانے کے لئے باربرداری کے لئے اور گھر کے کاموں کے لئے مویشی مہیا کرتے تھے۔ ترکی سے غلے اور مویشی کی برآمد بہت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔

۳۔ ہمیشہ سے یہ رسم چلی آتی تھی کہ عثمانی مسلمان، خصوصاً ترک، ہر بچے کو خواہ وہ شہزادہ ہی کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی صنعت یا پیشہ ضرور سکھاتے تھے عورتوں کو بھی کپڑا بننے اور کاڑھنے وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور دیہات میں وہ کھیتی باڑی کا کام کرتی تھیں گھر گرہستی کا سامان فرنیچر، سوتی ریشمی اور اونی کپڑا، چمڑا، جلد باندھنے اور رنگ بنانے کے لئے لکڑی کے برتن، چاندی کا کام، قالین بافی، کشیدے کا کام یہ سب چیزیں عموماً مسلمان بناتے تھے سوائے چاندی کے اور تمام خام اشیا جن کی ان صنعتوں میں ضرورت ہوتی تھی سلطنت کے اندر موجود تھیں۔

۴۔ تجارت اور پیشہ کی مختلف شعبوں میں تقسیم کر دی گئی تھی اور ان شعبوں کی نگرانی پیشہ وروں کی برادریاں کرتی تھیں جو اعلیٰ درجہ کی منظم جماعتیں تھیں ملک کے اندر جو کاروبار تھا وہ زیادہ تر انہیں کے ہاتھ میں تھا۔

۵۔ خشکی کا نقل وحمل جانوروں کے قافلوں کے ذریعے ہوتا تھا اور سمندر کا نقل وحمل جس میں بادبانی کشتیوں سے کام لیا جاتا تھا مسلمانوں اور ترکوں ہی کے ہاتھ میں تھا

۶۔ غیر مسلموں میں جو لوگ کام کرنے والے اور دولت پیدا کرنے والے تھے وہ زیادہ تر برآمد کے مال کے بیوپاری تھے۔

مشینوں کا دور آتے ہی نقل و حمل کا کام مسلمانوں کے ہاتھ سے بڑی حد تک نکل گیا بازار میں مشین کی بنی ہوئی چیزوں کی بھرمار ہو گئی اور مسلمانوں کی ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں گو وہ ان سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں تجارتی حیثیت سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں باہر کے مال کے بیوپاری ساری سلطنت میں غیر مسلم تھے۔

علاوہ اس اقتصادی فائدے کے فوجی خدمت سے بری ہونے کی وجہ سے بھی عیسائیوں کی آبادی اور ان کی مرفہ الحالی میں اضافہ ہو گیا اور مسلمان خصوصاً ترک تعداد میں گھٹ گئے اور افلاس اور جہالت میں مبتلا ہو گئے۔

عثمانی سلطنت بھی بازنطینی سلطنت کی طرح زوال کے زمانے میں برابر اناطولیہ سے سپاہی لے رہی تھی۔ غیر ملکیوں کے مخصوص حقوق نے سلطنت کی اقتصادی حالت کو اور بھی ابتر کر دیا۔ عثمانی ترکوں کے قسطنطنیہ کو فتح کرنے سے پہلے بازنطینی سلطنت نے بھی غیر ملکیوں کو یہ حقوق دے رکھے تھے بحرِ روم کے کنارے جتنے خطے واقع ہیں ان سب میں مختلف قومیں آباد ہیں اور سب تجارت پیشہ ہیں ایسے ملکوں میں جہاں رسم و رواج اور تمدن میں اس قدر اختلاف ہو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ سب کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ہر قوم اجتماعی مفاد کے لئے تھوڑی بہت قربانی کرے غرض ایشیائے کوچک میں غیر ملکیوں کے مخصوص حقوق تجارتی اور معاشی حیثیت سے ضروری تھے۔

عثمانی ترک جو بازنطینی سلطنت کے جانشین ہوئے، اتنے قوی تھے کہ اگر چاہتے تو ان انتظامات کو منسوخ کر دیتے۔ اس لئے ان کا ان حقوق کی توثیق کرنا نہ صرف ان کی رواداری کا بلکہ ان کی مصلحت شناسی کا بھی ثبوت ہے۔ ان کے سلطنت کی مرفہ الحالی ان انتظامات پر موقوف تھی۔ سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں اہل جنیوا کے حقوق کی توثیق کی۔ سلیمان اعظم نے ۱۵۳۵ء میں فرانس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ کیا۔ اور اس کے بعد اور ریاستوں سے بھی تجارتی معاہدے کئے گئے۔ ان سے دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچا اس لئے کہ دونوں کو اپنے مال کے لئے بازار کی ضرورت تھی۔

مگر جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو ان حقوق کی جو ابتدا میں صرف تجارتی حقوق تھے صورت بدل گئی ترکوں کی ہر شکست کے بعد فتح پانے والی قوم اپنے حقوق میں اضافہ کراتی گئی اور پھر یہ حقوق صرف تجارت تک محدود نہیں رہے بلکہ عدالتی امور پر بھی حاوی ہو گئے غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے علیحدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے یہاں تک کہ سلطنت کی رعایا میں سے بعض عیسائی فرقوں نے ان امور میں دوسری ریاستوں کی حمایت حاصل کر لی۔ اگر ان کا کوئی شخص عثمانی رعایا میں سے کسی شخص کے خلاف دعویٰ کرے تو مقدمے کا فیصلہ غیر ملک کے قنصل کی عدالت میں ہوتا تھا۔ اور اگر کہیں عثمانی رعایا میں سے کسی نے اُن کے کسی آدمی پر ہاتھ اٹھایا تو یہاں تک نوبت پہنچتی تھی کہ غیر ملکی جہازوں کے بیڑے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آ پہنچتے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں باب عالی نے کوئی نئی اقتصادی پالیسی اختیار کرنی چاہی تو وہ حکومتیں جن کی رعایا کو یہ خاص حقوق حاصل تھے

فوراً مداخلت کرتی تھیں بغیر ان کی مرضی کے کوئی تجارتی محصول عائد یا منسوخ نہیں کیا جاسکتا تھا اور کسی جگہ ریل نہیں بنائی جا سکتی تھی خواہ اقتصادی یا جنگی مصلحت سے کتنی ہی سخت ضرورت کیوں نہ ہو پھر یہ مصیبت بھی تھی کہ ان حکومتوں میں اکثر معاملات پر اتفاق رائے بھی نہیں ہوتا تھا براؤن کی کتاب "ترکی میں غیر ملکیوں کا مسئلہ" اور ارل کی کتاب "ترکی اور ریلوے" میں اس مسئلے پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔

مشرقی مسئلہ عثمانیوں کی ابتدائی تاریخ میں واقعی یورپ کی ریاستیں ترکی سے خائف تھیں اس کی وجہ صدیوں تک یورپ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور ہر معرکے میں فتح حاصل کرتی رہیں۔ صلیبی جنگوں سے بھی یہ بڑھتا ہوا سیلاب نہ رک سکا آخر میں ان ریاستوں نے آپس کی لڑائیوں میں ترکوں سے مدد مانگنی شروع کی۔ مگر جب عثمانی سلطنت کمزور ہوگئی تو انھیں اس کے حصے بخرے کرنے کی فکر پیدا ہوئی اور ان میں سے ہر ایک نے یہ چاہا کہ سب سے اچھا حصہ اسی کو ملے عثمانی سلطنت کا نام "مرد بیمار" رکھا گیا اور مغربی ریاستیں اس کے ورثے کی حق دار بن گئیں۔ ان میں اس میراث کے متعلق ابھی سے سودا بھی ہونے لگا اور نزاع بھی شروع ہوگئی۔ ان کی باہمی رقابتیں اور باہمی معاہدے سیاست اور حکمت عملی کا ایک طویل سلسلہ جو جدید تاریخ کا ایک ہنگامہ خیز گدلا سا باب ہے "مشرقی مسئلہ" کہلاتا ہے۔

عثمانیوں کے زوال کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے یورپ کی ریاستوں نے بلقان کی غیر مسلم جماعتوں سے ساز باز شروع کیا بلقان کے مختلف صوبوں میں الگ الگ قومیں

رہتی تھیں جو کم و بیش خود مختار تھیں بین الاقوامی سیاست کی بساط پر جو ترکی کے حصے بخرے کرنے کے لئے بچھائی گئی تھی یہ قومیں پیادوں کی طرح لڑائی گئیں اس بازی کے دو خاص مہرے تھے ایک مذہب دوسرے قومیت۔

جس وقت سے بازنطینی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور عثمانی ترک مشرقِ ادنیٰ پر قابض ہوئے یونانی کلیسا کبھی اس فکر سے غافل نہیں رہا کہ بازنطین کو پھر سے زندہ کرے۔ بطریق کا قصر اس تحریک کا مرکز تھا یونانیوں کے فرقہ وارانہ مدرسوں میں ایک ایک بچے کے دل میں یہ خیال بٹھایا جاتا تھا روس جو یونانی کلیسا کا پیرو تھا اس کی حمایت کا بیڑا اٹھا چکا تھا روسی سلطنت ابھی نوجوان تھی، وہ ملک گیری کا ولولہ رکھتی تھی اور اپنی زائد قوت کا مصرف ڈھونڈھتی تھی، پیٹر اعظم اور کیتھرین عظمٰے نے اس تحریک کی سرپرستی کی۔ روس کو بازنطینی سلطنت کا جانشین بنانا مقصود تھا۔ سچ پوچھیے تو روس کو قسطنطنیہ کی ضرورت بھی تھی، عثمانی سلطنت نے اسے بحیرۂ اسود اور بحر روم سے جدا کر دیا تھا گو شہنشاہی پسند روسی جتنی لڑائیاں لڑتے تھے زیادہ تر ملک گیری کی ہوس میں لڑتے تھے کہ مشرقِ ادنیٰ مشرق اقصٰے میں اپنے مقبوضات کو بڑھائیں مگر اس میں یہ جائز خواہش بھی شامل تھی کہ ان کے لئے سمندر کی راہ کھل جائے۔ غرض روس ترکی کے زوال کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے کھلم کھلا یونانی کلیسا کے پیرووں کا حامی بن بیٹھا۔ اس کے علاوہ اس نے بحیثیت ایک سلافی قوم کے عالمگیر سلافی اتحاد کی تحریک اٹھائی جس میں قومیت کی بنا نسل قرار دی گئی تھی بلقان کے اکثر لوگ سلافی نسل اور یونانی کلیسا کے تھے اور جو نسلاً سلافی نہیں تھے وہ بھی مذہباً یونانی کلیسا کے پیرو تھے اس لئے روس نے

یا تو مذہب کے یا قوم کے نام سے ان سب کو قابو میں کر لیا۔

بلقان میں قومیت کی تحریک کا نتیجہ پہلے پہل یہ ہوا کہ خود عیسائیوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یونانی اور سلافی کسی خاص خطے میں اپنی تعداد بڑھانے اور دوسروں کی گھٹانے کے لئے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے۔ اب رہا مذہب سو اس کا فیض یہ تھا کہ سب نے مل کر مسلمانوں کے قتل عام پر کمر باندھ لی۔ کیونکہ مذہب کا مفہوم ان کے نزدیک صلیب اور ہلال کا معرکہ تھا جب یونانی اپنے جنگ آزادی کے دوران میں موریا کے شہر تری پولیتزا میں داخل ہوئے تو انھوں نے صلیب کی فتح کی خوشی میں دو ہزار مسلمانوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھیں تہ تیغ کر دیا۔ عثمانی حکومت نے جو اپنے آپ کو قومی حکومت نہیں بلکہ ایک سلطنت سمجھتی تھی مسلمانوں کو ابتدا میں اس کا بدلہ لینے سے روک دیا۔

اس روسی ترقی اور عثمانی زوال کے دور میں انگلستان اور فرانس نے بارہا عثمانی سلطنت کا ساتھ دیا تاکہ روسیوں کا زور بہت نہ بڑھ جائے مغرب کی رائے عامہ کو اپنا حامی بنانے کے لئے روس نے مغربی ملکوں میں پروپیگنڈا کے مرکز قائم کئے کہ ترکی حکومت اور مسلمانوں کو مورد الزام ثابت کریں ہیملن جس نے استنبول میں رابرٹ کالج قائم کیا اپنی کتاب "ترکی میں پچاس برس" میں لکھتا ہے کہ جب کبھی میں اخبار میں عثمانیوں کے مظالم کی داستان پڑھتا تھا تو خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے توفیق عطا کر کہ اسے جھوٹ سمجھوں۔

یہ ہے عثمانیوں کے زوال کی مکمل تصویر۔

عثمانی حکومت کو اس ابتری کا اور اصلاح کی ضرورت کا احساس اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوا۔ ۱۷۷۴ء میں (یہ وہی سال ہے جس میں اسے شکست فاش اٹھانے کے بعد کوچک قنا ریہ کا معاہدہ کرنا پڑا) اس نے فوج میں مغربی ماہرین فن ملازم رکھے۔ مگر اصل میں اصلاح کی کوشش اور مغربی تمدن کو ترکی میں داخل کرنے کی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ اس صدی کے نصف اول میں تین قابل سلطان گزرے اور اسی زمانے میں سلطنت کے ایک عنصر یعنی ترکی قوم کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

سلیم ثالث نے ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۷ء تک حکومت کی۔ اُسے اس کے چچا عبدالحمید اول نے محل میں قید رکھ کر تعلیم نہیں دلائی تھی۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا شخص تھا اور بہت سی چیزوں میں خداداد قابلیت رکھتا تھا ترکی ادب کے علاوہ اس نے انقلاب فرانس کی تاریخ اور اس کے نظریات کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کیا تھا۔ جمہوریت کی تحریک نے جو اس زمانے میں یورپ پر چھائی ہوئی تھی اسے اسقدر متاثر کیا تھا کہ وہ صرف اصلاح ہی نہیں بلکہ نظام سلطنت کی از سر نو تشکیل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ جب تک پرانی فوج موجود ہے کوئی اصلاح ممکن نہیں۔ اس لئے اس نے "نظام جدید" کے نام سے ایک نئی فوج کی بنیاد ڈالی اس نے بہت سے نئے مدارس قائم کئے اور ان میں سے ایک میں یعنی انجنیری کے مدرسے میں وہ خود تعلیم دیتا تھا۔ پرانی فوج اس کی مخالف ہوگئی مگر نئی فوج جس کے افسر اصلاح کے جوش میں بھرے ہوئے تھے قوت میں اس سے کم نہ تھی۔

ملکی انتظام کی اصلاح میں اس نے مرکزیت کو توڑنے کی کوشش کی۔ صوبوں کی رعایا کو کونسلوں کے انتخاب کا حق دے دیا تا مقامی حکومت میں ان کی رائے کو بھی دخل ہو۔ اس کی وجہ سے تمام صوبوں کے گورنر اس کے مخالف ہو گئے کیونکہ وہ اب تک مطلق العنان تھے۔ اور اب ان کے اختیارات محدود ہو گئے۔ پس پرانی فوج اور ملکی ملازم دونوں اس کی اصلاحات میں روڑے اٹکانے لگے۔ اس کی نئی فوج بلقان کی کوئی شورش فرو کرنے کے لئے گئی ہوئی تھی کہ پرانی فوج نے موقع پا کر بلوہ کیا اور سلطان کو قتل کروا ڈالا۔ وہ ولیعہد سلطنت محمود ثانی کو بھی، جسے سلیم نے خود تربیت دی تھی، قتل کرنا چاہتے تھے مگر ایک عورت کے حسن تدبیر سے اس کی جان بچ گئی۔

محمود ثانی (۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء)

نئی فوج ۱۸۰۸ء میں علمدار مصطفیٰ پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کی طرف بڑھی اور اگرچہ وہ عین وقت پر پہنچ کر سلیم کی جان نہیں بچا سکی مگر اس نے اتنا ضرور کیا کہ محمود ثانی کو تخت پر بٹھا دیا۔ نئے سلطان کو مہلت حاصل کرنے کے لئے اپنے سرپرست سلیم کی اصلاحات منسوخ کرنی پڑیں۔ مگر وہ بھی اپنے رنگ میں غضب کا ذہین تھا۔ اس نے سلیم کی نئی فوج کو نام بدل کر پھر سے جمع کر لیا، روشن خیال علما کو اپنا طرفدار بنا لیا اور ان سے یہ اعلان کرا دیا کہ اس کی اصلاحات عین اسلام کے مطابق ہیں۔ اس نے استنبول کے باشندوں کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ ان باتوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے پرانی فوج کا خاتمہ کر دیا۔ اب اندرونی اصلاحات کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔

محمود ترکی کا پیٹر اعظم کہلاتا ہے۔ سب ارباب عمل کی طرح اس کا بھی یہ اصول تھا کہ ایسے کام شروع کرے جن کا نتیجہ فوراً نظر آنے لگے وہ اصلاحات کے معاملے میں ہر لحاظ سے سلیم کا پیرو تھا۔ بجز اس کے کہ وہ مرکزیت کا بڑا حامی تھا ابھی اس کی نئی فوج نے ایک سال کی تربیت بھی پوری نہیں پائی تھی کہ روس نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ یورپ کی سلطنتوں کا خصوصاً روس کا قاعدہ تھا کہ جب کبھی ترکی میں اصلاح اور بیداری کے آثار پائے اور سلطنت کو تقویت پہنچنے کا امکان دیکھا فوراً کسی نہ کسی بہانے سے جنگ چھیڑ دی۔ ابتدا میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑائی ملک کو تباہ کر دے گی مگر روس کو دوبارہ شدید مقابلہ کرنا پڑا اور دو بھاری فوجیں بھیجنی پڑیں جن کی تعداد ترکی کی فوج سے کہیں زیادہ تھی تب جا کر اس نے ترکوں کو صلح پر مجبور کیا اور صلح نامے میں اپنی شرطیں منظور کرائیں۔ محمود کی فوج نے اس جنگ میں ایسی قابلیت اور شجاعت کا ثبوت دیا کہ مسلمان اسی وقت سے مغربی طریق تنظیم کی برتری کے قائل ہو گئے۔ اس کے اصلاحی ضوابط کی جمہور نے بہت زور شور سے تائید کی اس نے گورنروں کے غیر محدود اختیارات کا خاتمہ کر دیا۔ اب انھیں کسی شخص کے ساتھ خلاف قانون سختی کرنے کا حق باقی نہیں رہا اس کے حکم سے بہت سے نئے مدرسے قائم کئے گئے۔ طبی مدرسوں میں مشہور و معروف پروفیسر وائنا سے بلا کر رکھے گئے اور اٹھائیس ترک یورپ کے مختلف ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ نئے ضوابط نے سرکاری ملازموں کی بہت سی بدعنوانیاں دور کر دیں اور سرکاری عدالتوں کے عدل و انصاف کی دھاک بٹھا دی۔ ایک موقع پر اس نے کہا "میں اپنی رعایا میں کسی قسم کا فرق

نہیں کرتا، مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے بعض مسجدوں میں جاتے ہیں، بعض گرجوں میں اور بعض یہودیوں کے معبدوں میں مگر جب باہر نکلتے ہیں تو سب برابر ہیں، طرز معاشرت کی اصلاح بھی سب سے پہلے اسی سلطان نے کی فوج میں مغربی لباس اور ترکی ٹوپی اسی کے عہد میں رائج ہوئی۔ محمود میں عجب بات یہ تھی کہ عزم واستقلال اور روشن خیالی کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا سخت دل تھا۔ اصلاحات کے جاری کرنے کے زمانے میں ترکوں کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا ہوا مگر محمود کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی۔ جنگ روس یونانیوں کی شورش جس نے جدید یونانی ریاست کی بنا ڈالی۔ موریا کے مسلمانوں کا قتل عام، دوسرے مسلمانوں کو انتقام سے روکنے کی دشواریاں، مصر کے گورنر محمد علی کی سرکشی، اس کے ہمنام گورنر مصر کی بغاوت جو قریب تھا کہ خود تخت عثمانی پر قبضہ کرلے یہ سب واقعات محمود ہی کے عہد کے ہیں۔

عبدالمجید اول (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء)

محمود کے عہد میں اصلاحات کا پہلا دور ختم ہوگیا اور عبدالمجید کے زمانے میں دوسرا دور جو اس سے زیادہ اہم ہے اور تنظیمات کے نام سے موسوم ہے شروع ہوا۔ محمود کے زمانے میں جو کچھ تبدیلی ہوئی تھی وہ حکومت میں ہوئی تھی اور جو کچھ اصلاحات کی تھیں وہ حکومت نے کی تھیں۔ تنظیمات کے زمانے میں اصلاح کا اثر اس سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ یعنی خود جمہور کے اندر تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اس کا سہرا عام درسگاہوں کے سر نہیں بلکہ اُس عظیم الشان مدرسے کے سر تھا جسے قومی ادب کہتے ہیں۔ ہم اس کا ذکر آئندہ لکچر میں جو ترکی ادبیات کے متعلق

ہے کروں گی۔

عبدالمجید کو خوش قسمتی سے کئی زبردست مدبر ہاتھ آگئے تھے ان میں سب سے ممتاز مصطفےٰ رشید تھا۔ اس دور کا آغاز کلہان کے خط ہمایوں (فرمان سلطان) سے ہوتا ہے۔ (کلہان اس مقام کا نام ہے جہاں سے یہ فرمان جاری کیا گیا تھا) کھلے میدان میں ایک بہت بڑے مجمع کے درمیان جس میں ممالک غیر کے سفرا بھی موجود تھے مصطفےٰ رشید نے فرمان سلطانی ممبر پر کھڑے ہو کر سنایا۔ اس کی خوشی میں توپیں سر ہوئیں اور چراغاں کیا گیا۔ ایک مجسمہ نصب کرنے کی بھی تجویز تھی مگر اس وقت یہی مناسب معلوم ہوا کہ رجعت پسندوں کو زیادہ بھڑکانا نہیں چاہیئے۔

اس فرمان کے ذریعے بہت سی اصلاحوں کو جو محمود کے حکم سے ہوئی تھیں قانونی شکل دے دی گئی فرڈی ننڈلاسال کہتا ہے "انقلاب کسی شخص کے کرنے سے نہیں ہوتا انسان تو بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جو انقلاب معاشرتی حالات کی وجہ سے خود بخود ہو گیا ہے اسے قانون کے ضابطے میں لے آئے اور عملی شکل دے دے" تنظیمات کا کام صرف یہ تھا کہ جو کچھ سلیم اور محمود کے زمانے میں ہو چکا ہے وہ دستوراً و قانون کی رو سے جائز قرار دے دیا جائے۔"

جو شخص تنظیمات پر ایک سرسری نظر بھی ڈال لے گا اسے ۔ اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں جو مقاصد مد نظر تھے وہ تو نہایت عظیم الشان تھے مگر ان کا جتنا حصہ ہزارہا مشکلات کے باوجود عمل میں لایا گیا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ ان پر چاہے جتنے اعتراض کئے جائیں مگر یہ ضرور

تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے ایک نہایت اہم نتیجہ برآمد ہوا یعنی جدید ترکی کی بنیاد قائم ہو گئی۔ انھوں نے ترکوں کی قوم کو اس قابل کر دیا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود مسمار شدہ سلطنت کی بنیادوں پر ایک نئی عمارت بنا کر رہے۔

تنظیمات کے بانیوں نے عثمانی تاریخ میں دوسری بار نظام سلطنت کی تجدید کی کوشش کی۔ ان اصلاحات میں دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی بنا کن خیالات پر ہے دوسرے یہ کہ ان کا نفاذ کن لوگوں میں ہوا

مشرقی عنصر قدیم عثمانیوں کی طرح تنظیمات کے بانیوں کے خیالات میں بھی مشرقی اور مغربی دونوں عناصر موجود تھے مگر تیرھویں صدی سے انیسویں صدی تک ترکی کا زمین و آسمان بدل چکا تھا۔ ارباب تنظیمات کے خیالات میں غالب رنگ مشرق ہی کا تھا مسلمان ترکوں کے ادب اور ان کی زندگی میں ایک باطنی روحانی فلسفہ سرایت کر گیا تھا جو مشرق سے آیا تھا۔ جمہور اخلاقی اور روحانی قدروں کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے تھے ارباب فکر اور ارباب سیاست میں جو لوگ مغربی رنگ کے تھے وہ بھی اپنے قومی تمدن کی طرف سے بے پروا نہیں تھے۔ وہ فرانس کے قاموس نگاروں کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ مغرب سے انھوں نے وہی چیزیں لے لی تھیں جو ان کی مشرقی طبیعت سے زیادہ مناسبت رکھتی تھیں۔

فرانس کے انقلاب سے دنیا میں دو تحریکوں کا آغاز ہوا۔ ایک قومیت کی تحریک دوسرے جمہوریت کی۔

تنظیمات کے بانیوں نے ان میں سے جمہوریت کو اختیار کیا ان کے اہل قلم بڑے

زور شور سے "حقوق انسانی" کی حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے سلطنت کے سامنے جو نصب العین پیش کیا اس کی جڑیں ان کے احساس ترکیب اور جذبہ اسلامیت میں پیوست تھیں۔ اس لئے کہ ان کی قدیم تاریخ میں "حقوق انسانی" کا ڈنکا سب سے پہلے اسلام نے بجایا تھا برخلاف اس کے عیسائی جماعت نے قومیت کے خیال کو لیا۔ تنظیمات کے بانیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی تفریق اور اشتعال پیدا کرنے والی قوت حقیقی وجود رکھتی ہے۔ تفرقہ پسندوں کی تحریک کو وہ محض بری حکومت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اصلاحات سے، اچھی حکومت سے، جمہوریت کی تلقین اور اس پر عمل کرنے سے قومیت کی سیاسی تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ان لوگوں کی حکومت کی پالیسی میں اول سے آخر تک کبھی تشدد سے کام نہیں لیا گیا۔ وہ اپنی "اتحاد عناصر" کی پالیسی اچھی حکومت اور تعلیم کی مدد سے چلانا چاہتے تھے اس لئے ان کی ساری کوششیں اور ساری اصلاحات عثمانی سلطنت کے سوتیلے بیٹوں یعنی عیسائیوں کے فائدے کے لئے تھیں حالانکہ ان عیسائیوں کو عثمانی قوم کے دائرے میں رہنا ہی منظور نہ تھا۔

سب سے بہتر انتظامی اصلاحات سب سے زیادہ قابل آدمیوں کے ہاتھ سے بلغان یعنی بلغاریہ میں عمل میں آئیں تعلیم میں انھوں نے یہ کوشش کی کہ اچھے مدرسے قائم کر کے عثمانی رعایا کے مختلف عناصر کو متحد کریں ۱۸۴۶ء میں ایک مجلس تعلیمی قائم کی گئی جس نے بہت سے ابتدائی اور ثانوی مدرسے کھولے۔ سرکاری ثانوی مدرسوں میں سب نسلوں اور فرقوں کے بچے ساتھ ساتھ پڑھنے لگے۔

غلطہ سرائے کے مدرسوں سے تنظیمات کے نفاذ میں بڑی مدد ملی۔ ان میں سول سروس کے عہدہ داروں کی تربیت ہوتی تھی۔ اور ترکوں اور دوسری قوم کے لوگوں کو ان علاقوں کی زبانیں سکھائی جاتی تھیں جہاں انھیں کام کرنا ہو۔ بلقان خصوصاً بلغاریہ کے نوجوانوں کی تربیت میں غلطہ سرائے کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان سب چیزوں سے اتحاد عناصر کے مقصد میں ایک حد تک کامیابی ہوئی۔ مگر قومیت کا نصب العین جمہوریت سے کچھ کم قوت نہیں رکھتا اگر غیر مسلم قوموں کو باہر سے شہ نہ بھی ملتی تب بھی اس میں شبہ ہے کہ وہ اپنے قومیت کے خیال کو ترک کر دیتے اور سلطنت کے وفادار شہری بن جاتے۔ عیسائی بچوں کی ابتدائی تعلیم صدیوں سے انھیں تفریق کا سبق دے رہی تھی اس پر طرہ یہ کہ مغربی ممالک خصوصاً روس نے پورا زور لگا دیا کہ تنظیمات کو ترکی رعایہ کے متحد کرنے میں کامیابی نہ ہو۔ چھوٹی بڑی شورشیں، لڑائیاں، یہ اعتراض کہ اصلاحات کی رفتار سست ہے، یہ احتجاج کہ اصلاحات کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، یہ سب کچھ عیسائیوں ہی کی طرف سے ہوا۔ غرض باوجود اس کے کہ تنظیمات سے عیسائیوں کو بہت فیض پہنچا وہ عیسائیوں میں بالکل مقبول نہیں ہوئیں۔

تنظیمات کے بانیوں نے عیسائیوں کو سلطنت کے وفادار شہری بنانے کی کوشش میں ایک بات کو بالکل نظر انداز کر دیا لوگ محض حقوق مل جانے سے شہری نہیں بن جایا کرتے اس کے لئے فرض اور خدمت کا بوجھ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ اگر وہ کچھ لیتے ہیں تو انھیں کچھ دینا بھی چاہیئے جس سے ہمیں کچھ ملتا ہے اُن سے اتنا گہرا تعلق اتنی

پائدار محبت نہیں ہوتی مگر جن لوگوں اور چیزوں کی ہم نے خدمت کی ہے، جن کی خاطر ہم قربانیاں کر چکے ہیں ان کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے یہ انسان کا ایک خاصّہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا قومیت کی خاطر عیسائیوں نے قربانیاں کیں، جمہوریت سے انھوں نے فائدے اٹھائے وہ فوجی خدمت سے بری رکھے گئے۔ ان کی ملت جدا تھی اور جدا رہی

گو ترکی قوم کو تنظیمات سے مادی نقصان پہنچا مگر میرے خیال میں انھیں جو فائدہ حاصل ہوا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا ان اصلاحات کی بدولت ان کی فطری صفات کو' ان صفات کو جن سے قومیں بنتی ہیں تقویت اور نشو و نما ہوئی۔

عثمانی ترک سلطنت قائم کرنا اور اس کی خاطر جان دینا پہلے سے جانتے تھے۔ مگر اب سلطنت اور سلطان سے زیادہ انھیں اپنے ملک سے محبت ہو گئی۔ حکمراں اور غیر حکمراں طبقے کے دل میں ایک نیا جذبہ حب وطن اور حب قوم کا موجزن ہو گیا۔ آزادی ہمیشہ سے ترکوں کا ایمان ہے اگر انھیں فرصت نصیب ہوتی اور وہ اپنے ملک کی یورپین جماعت کی طرح مغرب جدید کے تجارتی رنگ میں ڈوب کر دولت سمیٹنے لگتے تو وہ سرمایہ داری کی زبردست عالمگیر قوت کے غلام اور آلہ کار بن کر رہ جاتے۔ پھر انھیں کوئی چیز اس پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی کہ آزاد ترکی' جدید ترکی کی خاطر پشت در پشت اپنی جانیں قربان کر دیں۔

قومی آزادی کے نصب العین کی دائمی وفاداری کے علاوہ تنظیمات کے لوگوں کے ذہن میں انفرادی آزادی کا تصور، اپنے ملک کی حکومت میں حصہ پانے کی خواہش بھی

پیدا کی۔ یہ چیز ترکوں کی نظر میں کیا قدر و قیمت رکھتی تھی اور انھوں نے اس کی خاطر کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں اس کا آئینہ سارا ترکی ادب ہے۔ چند سیاست دانوں اور انشاپردازوں نے مل کر آئینی حکومت کے مطالبے کے لئے ایک سیاسی تحریک کی بنا ڈالی جو آگے چل کر نوجوان ترکوں کی تحریک کہلائی

سلطان عبدالعزیز کے عہد سلطنت کا آخری زمانہ تھا۔ بوڑھے سلطان کے دل میں استبداد کا جذبہ جو اب تک دبا ہوا تھا ابھرنے لگا مخالف خیالات رکھنے والے لوگ بغیر عدالتی تحقیقات کے جلاوطن کئے جانے لگے تنظیمات کے بعد کی حکومت میں جو مفید استبداد کا عمدہ نمونہ تھی، انفرادی آزادی قریب قریب پوری نشوونما پا چکی تھی اور نوجوان ترکوں کی انجمن قوت پکڑ چکی تھی، اس انجمن نے سلطان عبدالعزیز کو معزول کر دیا عبدالحمید ثانی تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس نے جمہور کو پہلا دستور (۱۸۷۶ء) میں عطا کیا۔

اس عہد اصلاحات (۱۸۳۹ء تا ۱۸۷۶ء) میں مشرق اور مغرب کی کشمکش کا ماحصل یہ تھا کہ عثمانیوں کی دنیا میں مغرب جدید کا اثر ایک طرز خیال کی شکل میں دخیل ہو گیا ان کی زندگی میں تبدیلیاں ہونے لگیں مگر ایسی جن میں قدیم روایات کی روح موجود تھی: "حقوق انسانی" کا نیا نظریہ مساوات کے اسلامی نصب العین کی ایک وسیع تر شکل تھی۔ جو حقوق اسلام نے مسلمانوں کو عطا کئے تھے وہ اب غیر مسلموں کو بھی دیئے گئے۔ پہلے عثمانی انھیں حکومت میں اس وقت شریک کرتے تھے جب وہ اسلام

قبول کر چکے ہوں۔ اب صرف حکمران طبقے کے باہر ہی نہیں بلکہ اس کے اندر بھی ہر شخص کو مذہبی آزادی مل گئی نیا دستور اسی حق مشورت کی تجدید تھی جو اسلام نے خاص وعام سب کو دے رکھا تھا۔ غرض مغرب کے نئے طریقے ایک ایک کر کے پرانے مشرقی رنگ میں رنگ لئے گئے اور نظام سلطنت میں شامل کر لئے گئے ابھی تک مشرق اور مغرب کی کشمکش میں کسی کو فتح نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ تنظیمات کی بدولت مشرقی ادنیٰ میں پھر ان دونوں تہذیبوں میں ایک نیا امتزاج ہو جاتا جیسے ایک بار عثمانیوں کے ابتدائی دور میں ہوا تھا۔ مگر عبدالحمید ثانی نے یہ نہیں ہونے دیا۔

اگر جدید ترکی اور بدنصیب عثمانی خاندان شاہی مل کر کوئی یوم ماتم منائیں تو یہ وہ ہوگا جب عبدالحمید ثانی نے تخت پر قدم رکھا اس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم اس کے عہد حکومت پر تبصرہ کرتے ہیں

ولیعہدی کے زمانے میں وہ بڑا ذہین اور روشن خیال سمجھا جاتا تھا اور نوجوان ترکوں اور ان کے لیڈر مدحت پاشا کو، جو جدید ترکی کے بزرگ ترین مشاہیر میں سے تھا۔ اس پر پورا اعتماد تھا گو اسے ان لوگوں پر ذرا بھی اعتماد نہ تھا تخت حاصل کرنے کے لئے وہ دستور دینے پر راضی ہو گیا

اس زمانے میں ایک بین الاقوامی مجلس جس میں تمام مغربی ریاستوں کے نمائندے شریک تھے استنبول میں بوسینا، سرویہ، اور بلغاریہ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی۔ اس نے یہ تجویز کی کہ ان علاقوں کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن اور ایک

گورنر جنرل مقرر کیا جائے۔ عبدالحمید نے دیکھا کہ اس سے عثمانی اقتدار کو سخت نقصان پہنچے گا دوسری طرف اس نے یہ سوچا کہ اگر اس وقت لڑائی چھیڑ دی جائے تو دستوری حکومت اور پہلی پارلیمنٹ جو ابھی قدم بھی ہیں جمانے پائی ہے، ختم ہو جائے گی۔ دونوں وجوہ اس تجویز کو رد کرنے کے لئے کافی تھیں۔ چنانچہ اس نے اسے نامنظور کر کے جنگ کا اعلان کر دیا اور پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔

لڑائی سال بھر سے زیادہ چلی ترکی کو نہ صرف یورپ میں بلکہ ایشیائے کوچک میں بھی شکست اٹھانی پڑی۔ روسی فوج ایڈریانوپل تک پہنچ گئی اور جنوری ۱۸۷۸ء میں صلح کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔

باب عالی کو ایک سال پہلے آپس میں مفاہمت کر لینے سے جتنا نقصان ہوتا اس سے کہیں زیادہ اب ہوا۔ رومانیہ، سرویہ اور بلغاریہ علحدہ ریاستیں بنا دی گئیں جن کی سرحد بحیرہ اسود اور بحر روم تک پہنچتی تھی، مشرق میں اردن اور بایزید روس کو دے دئے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں سین اسٹفانو کے مقام پر صلح نامے پر دستخط کر دئے گئے۔ اسی سال جون میں برلن کی کانگرس نے جس میں روس بھی شریک تھا اس میں کچھ ترمیم کی۔ سرویہ، مانٹی نیگرو اور رومانیہ کی آزادی تسلیم کر لی گئی مگر بلغاریہ کے دو حصے کئے گئے۔ ایک کو عثمانی سلطنت کے ماتحت حکومت خود اختیاری دی گئی تا بایزید کا خطہ عثمانی حکومت میں رہا۔

عثمانی سلطنت کو شکست کے یہ نتیجے دیکھنے پڑے۔ اتنی کامیابی اسے ضرور

ہوئی کہ قبرس کا جزیرہ دے کر اس نے انگلستان سے باہمی مدافعانہ امداد کا معاہدہ کر لیا مگر صلح نامہ برلن میں ایک ایسی دفعہ تھی جس کے نتائج بہت دور تک پہنچے۔ اس کے اندر آرمینیہ کا لفظ تاریخ میں پہلی بار استعمال ہوا اور مشرقی صوبوں میں اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے معنی صاف طور پر یہ تھے کہ وہی قومیت کی جنگ جو مقدونیہ میں برپا کی گئی تھی اور جس میں مغرب کی ریاستیں اپنے اپنے مہروں کو لڑا رہی تھیں اب اناطولیہ میں بھی چھڑ جائے گی۔

اس کے بعد عبدالحمید نے اپنی سلطنت کے ۳۳ برس میں جنگ سے بچنے کی انتہائی کوشش کی۔ اور سوائے ۱۸۹۷ء کی جنگ یونان کے کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ وہ داخلی اور خارجی معاملات میں ایک واضح اور معین پالیسی رکھتا تھا۔

داخلی پالیسی | وہ ایک استبداد پسند سلطان تھا اور استبداد کو بھی اس نے مطلق العنانی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ اسے سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ تنظیمات کے دور میں حکومت کے اختیارات قصر سلطانی سے باب عالی کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ عبدالعزیز نے اپنی سلطنت کے آخری زمانے میں بہت زور لگایا تھا مگر وہ حکومت کے مرکز کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکا۔ اس کی راہ میں سب سے زیادہ مدحت پاشا اور اس کے پیرو حائل تھے۔ گو عبدالحمید نے پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کے ساتھ ہی مدحت پاشا کو جلا وطن کر دیا تھا۔ مگر اس کے خیالات کا اثر لوگوں کے دل سے نہیں مٹا سکتا تھا آخر اس نے یہ ترکیب کی کہ مدحت پاشا کو سمرنا کا گورنر مقرر کرنے کے بہانے سے واپس بلایا

اور جب وہ آگیا تو اس پر عبدالعزیز کے قتل کا الزام لگا کر تحقیقات کا حکم دیا۔ تحقیقات کیا تھی مگر وہ ما کا ایک نظر فریب منظر تھا مدحت پاشا کو قتل کی سزا دی گئی سلطان نے سزا میں تخفیف کر کے اسے حبس دوام سے بدل دیا۔ یہ محض دکھانے کے لئے تھا مدحت پاشا طائف میں قید کیا گیا۔ اور عبدالحمید کے حکم سے وہ چند اور آدمیوں کے ساتھ قید خانے میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے بڑی مشکل سے حکومت کا مرکز باب عالی سے ہٹا کر پھر قصر سلطانی میں پہنچایا۔

مدحت اور ان کے پیرو جلاوطن ہوئے، قتل کئے گئے یا اپنی موت مر گئے مگر ان کے خیالات لوگوں کے دلوں میں باقی تھے۔ یہ بات عبدالحمید کو کھٹکتی تھی۔ اس نے ان لوگوں کی تصانیف کو ممنوع قرار دیا جس کسی کے پاس تنظیمات کے متعلق کوئی کتاب پکڑی جاتی تھی اسے بہت سخت سزا ملتی تھی۔ ایسی کتابوں کا ایک صفحہ بھی پڑھ لینا بغاوت میں داخل تھا۔ آزادی، دستور، حب وطن اور اس قسم کے دوسرے الفاظ لغت کی کتابوں سے نکال ڈالے گئے۔

تنظیمات سے ترکوں کو اور ان میں خاص کر نوجوانوں کو ایک طرح کی مذہبی عقیدت تھی بیس برس تک عبدالحمید نے جاسوسوں کے محکمے کے ذریعے سے، جو دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، ترکوں کے خیالات کو دبانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اگر روس میں ارباب نظر کے لئے سائبیریا تھا تو ترکی میں بھی طرابلس کا صحرا اور یمن موجود تھا۔ میری زبان میں یہ طاقت نہیں کہ اس عہد میں ترکی کے نوجوانوں پر جو مظالم ہوئے ہیں

انھیں بیان کر سکیں خدا جانے کتنے جلا وطنی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے ہوں گے جو لوگ کہتے ہیں کہ ترک اپنے عقیدے کی خاطر تکلیفیں نہیں اٹھا سکتے وہ ذرا اس زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔

عبدالحمید نے یہ کوشش کی کہ اپنی رعایا میں سے ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو ان کے سرداروں کے ذریعے سے اپنا حامی بنائے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اس نے کرد، عرب، اور البانی رئیسوں پر لطف و کرم کی بوچھاڑ کر دی اور انھیں اپنے مقربین میں داخل کر لیا تنظیمات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترکی زبان میں تھا اور دوسرے مسلمانوں پر ان خیالات کا اثر نہیں ہوا تھا اس لئے ان پر اس دور استبداد میں اتنی سختیاں نہیں ہوئیں جتنی ترکوں پر کی گئیں۔ اور ابھی ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ یہ مرحمت خسروانہ محض رشوت ہے جو انھیں اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ ترقی نہ کر سکیں اور انھیں نئے خیالات کی ہوا نہ لگنے پائے فوجی خدمت کا بار جس کی گرانی اور سختی کی کوئی انتہا نہ تھی اس عہد میں قریب قریب پورا ترکوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس رجحان کی وجہ سے جو عبدالحمید کو مسلمانوں کی طرف تھا اس کی داخلی پالیسی میں خلافت کو بڑی اہمیت تھی وہ جانتا تھا کہ ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو اس کی ذات سے وابستہ کرنے والی سب سے بڑھ کر یہی چیز ہو سکتی ہے۔

آرمینیوں کی طرف سے بھی عبدالحمید کو بڑا خطرہ تھا جب سے عہد نامہ برلن میں ان کا نام ایک قوم کی حیثیت سے لیا گیا ان کی امیدیں بہت بڑھ گئی تھیں، روس ان کی

حمایت کے لئے موجود تھا۔ انھوں نے اپنی سیاسی کمیٹیاں بنا کر جدوجہد شروع کردی۔ برخلاف نوجوان ترکوں کے انھوں نے بے تکلف تہدیدی طریقے اختیار کر لئے اور بم پھینکنے لگے۔ عبدالحمید نے دارالسلطنت میں بھی اور مشرقی صوبوں میں بھی ان کی شورشوں کو بڑی سختی سے کچل دیا۔ مشرق میں وہ آرمینیوں کی سرکوبی کا کام مسلمان کردوں سے لیتا تھا۔ مگر مجموعی حیثیت سے اس نے آرمینیوں پر اتنا ظلم نہیں کیا جتنا وہ ترکوں پر کرتا تھا۔

خارجی پالسی ۱۸۷۸ء کے بعد انگلستان، روس، اور فرانس نے "مرد بیمار" کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ عبدالحمید اپنی ذہانت سے اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ ان میں سے کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کی ریاستوں میں صرف جرمنی اعتبار کے قابل تھا اس لئے کہ وہ مشرق ادنٰی میں صرف اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتا تھا اسکا مقصد مقبوضات حاصل کرنا نہیں تھا۔

خارجی سیاست کی بساط پر عبدالحمید کے پاس بس دو ہی مہرے تھے۔ عالمگیر اسلامیت اور خلافت، مگر تھے یہ دونوں زبردست مہرے اور پھر عبدالحمید کی چالیں بھی غضب کی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک اس کی مسلمان رعایا ایک رشتے میں مربوط ہے اور مغربی ریاستوں کی حکومت کو ناپسند کرتی ہے عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنا ممکن نہیں۔ کم سے کم اس کی زندگی میں تمام مسلمان سلطنت کے حامی اور مددگار رہیں گے۔ ان میں اکیلے عرب ہی ڈیڑھ کروڑ کے قریب تھے۔

عربوں اور دوسری مسلمان قوموں کو ترکی سلطنت سے توڑنے کی صرف ایک تدبیر تھی ۔ وہ یہ کہ ان میں قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے ۔ ان میں سے عربوں کو تو یہ صورت تھی کہ اگر انھیں مغربی ریاستیں نہ بھی اکساتیں تب بھی ان میں ایک نہ ایک دن قومیت کا جذبہ پیدا ہو کر رہتا ۔ ان کی تعداد ترکوں سے کسی طرح کم نہ تھی ۔ مگر حریف یہ چاہتے تھے کہ قومیت کی تحریک اسی وقت شروع ہو جائے ۔ اس لئے کہ ترک اور عرب ابھی اتنی سیاسی عقل نہیں رکھتے تھے کہ آپس میں کسی قسم کی مفاہمت کر لیں اور مغرب والوں کا قدم درمیان میں نہ آنے دیں ۔ چنانچہ مغربی ریاستوں نے عبدالحمید کی عالمگیر اسلامیت کا جواب یہ دیا کہ مسلمانوں میں قومیت کا جذبہ ابھارنے کی کوشش شروع کر دی ۔

انگلستان ، روس ، اور فرانس تینوں کی رعایا میں مسلمان کثرت سے تھے ۔ ایک خود مختار اسلامی سلطنت جس کا فرمانروا خلافت کو اس قدر اہمیت دیتا تھا ان کی نظر میں ایک بری مثال تھی ۔ گو اس کا اثر ان کی اسلامی مقبوضات پر نہ پڑتا ہو تب بھی ان کے لئے بہتر یہی تھا کہ اس بری مثال کو قائم نہ رہنے دیں ۔ غرض ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا مغربی ریاستوں کے نزدیک نفسیاتی پہلو سے نہایت ضروری تھا ۔ اگر کوئی پوچھے کہ انھوں نے یہ پہلے ہی کیوں نہیں کیا تو اس کے دو وجوہ سمجھ میں آتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ایسے حصے کرنے میں جس میں سب خوش رہیں بہت دیر لگی ۔ دوسرا یہ کہ ترکوں نے ۱۸۹۷ء میں جو فتح یونانیوں پر حاصل کی اس سے ثابت

ہوگیا کہ عثمانیوں کی فوجی طاقت ابھی تک ایسی ہے جس سے نپٹنا سہل نہیں۔

ترک ان تمام بیرونی خطروں سے غافل نہیں تھے۔ پیرس میں نوجوان ترکوں کی کمیٹی موجود تھی مگر وہ اپنے ملک کی رائے عامہ پر اس سے زیادہ اثر نہیں ڈال سکتی تھی کہ کبھی کبھی ایک آدھ پمفلٹ بھیج دیا کرے۔ خود ترکی میں کوئی انجمن قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے کہ جاسوسی کے محکمہ کا جال سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ البتہ جب بلغاریہ کی بغاوت کے بعد باب عالی نے تین صوبوں اسکوب، مناستر، اور سالونیکا کے لئے اصلاحات منظور کرلیں اور ان میں ایک ترکی ناظم مقرر کیا گیا جس کی مدد کے لئے غیر ملکی ماہرین خصوصی رکھے گئے تو ان صوبوں میں اتنی آزادی میسر آئی کہ انقلابی انجمنیں قائم کی جاسکیں۔ چنانچہ انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک مجلس قائم ہوئی اور اس کی تنظیم فراماسن لاج کے نمونے پر کی گئی۔ اس میں نوجوان فوجی مثلاً اسٹاف افسر وغیرہ کثرت سے شریک ہوگئے۔

۱۹۰۸ء میں زار نکولس اور شاہ ایڈورڈ کی ملاقات کی بنا پر یہ افواہ مشہور ہوئی کہ ترکی کی تقسیم کا ایک نیا منصوبہ سوچا گیا ہے۔ نوجوان ترکوں نے مقدونیہ میں دستوری حکومت کا اعلان کردیا اور سلطان کو مجبور ہوکر ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو دستور کی منظوری دینی پڑی۔ پہلی آزادی سے منتخب کی ہوئی پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ جس میں تمام قوموں کی طرف سے بہترین نمائندے بھیجے گئے تھے۔ پارلیمنٹ کا افتتاح کرنے کے بعد عبدالحمید نے ایک سال یعنی ۱۹۰۹ء تک اور حکومت کی۔ ۱۹۰۹ء میں رجعت

پسندوں کی طرف سے جوابی انقلاب ہوا۔ اس کی وجہ کچھ تو نوجوان ترکوں کی ناتجربہ کاری تھی اور کچھ بیرونی سلطنتوں اور یونانی بطریق کا پروپاگنڈا جو رجعت پسند اخباروں کو امداد دیکر کرایا جاتا تھا۔ یہ بڑی خونریز اور ناپاک شورش تھی۔ بہت سے نوجوان محض اس لئے قتل کردئے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے۔ کالر مذہب کی شدید مخالفت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ محمود شوکت پاشا مقدونیہ سے اپنی فوج کے ساتھ استنبول کی طرف بڑھے، انھوں نے عبدالحمید کو معزول کردیا اور اس روز سے حکومت درحقیقت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آگئی۔

عبدالحمید اپنے محل میں نظر بند رہا اور ۱۹۱۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ برا ہی، مجنون سہی، مگر اس کے جنون میں بھی ایک بات تھی پھر بھی میں وہی کہوں گی جو پہلے کہہ چکی ہوں کہ اگر ترکی قوم اور بدنصیب عثمانی خاندان مل کر کوئی قومی یوم ماتم قرار دیں تو وہ عبدالحمید کی تخت نشینی کا دن ہونا چاہیئے۔

"تنظیمات نے اصلاحات کی راہ ہموار کردی تھی کہ استبدادی حکومت رفتہ رفتہ جمہوری حکومت بن جائے ترکوں کے ذہنی تغیر میں توازن کی شان تھی وہ اپنی تہذیب اور روایات کی زمین میں مغربی خیالات اور ادارات کے بیج بو رہے تھے ان کے سلاطین خود اصلاحات کے بانی یا کم سے کم حامی تھے اور امید تھی کہ نئے سیاسی اور معاشرتی نظام میں سلطان کو ایک اہم حیثیت حاصل ہوگی۔ یعنی آئینی شاہی حکومت قائم ہوجائے گی جس میں سلطان کی ذات ہیئت اجتماعی میں اتحاد اور استحکام پیدا کرنے والی قوت ہوگی۔

مگر عبدالحمید نے آکر سارا کھیل بگاڑ دیا اس کے عہد میں ۳۳ برس تک ظلم و جور کا دور دورہ رہا ظاہر ہے کہ اس فضا میں تنظیمات کے خیالات پرورش نہیں پا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اَن گھڑ تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا جس کے دل میں انتقام کا جوش اور سر میں انقلاب کا سودا تھا۔ اپنی تہذیب اور پرانے خیالات میں کوئی توازن باقی نہیں رہا عوام کے دل میں غیر شعوری طور پر اور خواص کے دل میں شعوری طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سلطان کی ذات بھی علما کی طرح ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

عبدالحمید چاہتا تھا کہ قوم کی جڑیں اپنی تہذیب کی زمین میں پیوست رہیں مگر اسے یہ خبر نہ تھی کہ وہ خود ہی ان جڑوں کو کاٹ رہا ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں اب حکومت آئی وہ مغرب کو بھی اتنا ہی بڑا دشمن سمجھتے تھے جتنا عبدالحمید کو مگر پھر بھی وہ مغربی خیالات اور مغربی طریقوں کو اختیار کرنے پر مجبور تھے ۱۹۰۸ء میں دنیا کا جو رنگ تھا اسے دیکھتے ہوئے اس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا تھا۔ چنانچہ اب سلطنت عثمانی میں مشرق اور مغرب کی کش مکش کی صورت یہ تھی کہ مغرب کے سامنے فتح کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔

تیسرا خطبہ

انقلاب اور جنگ

خواتین اور حضرات!

دستوری حکومت کے پہلے دو مہینے تو اس قابل ہیں کہ تنقیدی تاریخ کے نہیں بلکہ عثمانی شاعری کے موضوع بنائے جائیں۔ لوگوں کے دل جوش سے معمور تھے۔ وہ آزادی، مساوات اور انصاف کی خوشی میں مگن تھے جس شخص نے ترکی کا وہ زمانہ دیکھا ہے اسے یاد کرکے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس میں انقلاب فرانس کی سرمستیاں موجود تھیں مگر وہ خونریزیاں نہ تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے بجائے فرط محبت سے گلے ملتے تھے۔ عثمانی سلطنت کی تاریخ میں یہ ایک ہی مثال ہے۔ کہ کل قومیں ایک نصب العین رکھتی تھیں۔ ایک ملک سے محبت رکھتی تھیں۔

ابتدا میں ارباب اتحاد و ترقی نے اپنی ناتجربہ کاری کو محسوس کرکے حکومت ان آزمودہ کار بوڑھوں کے سپرد کر دی تھی جن سے انھیں اپنے مقاصد کے پورے ہونے کی امید تھی۔ مگر کچھ تو جوانی کی بے صبری اور کچھ ۱۹۰۹ء کے جوابی انقلاب کی

وجہ سے اب انھوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دو مہینے بعد جب انقلاب کا نشہ اترا تو یہ فکر ہوئی کہ ان تمام قوموں کو جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں ملا کر ایک قوم بنائی جائے۔ اس اتحاد کی کوشش کا شروع ہونا تھا کہ پھر تفریق اور انتشار کے آثار نظر آنے لگے۔

اندرونی مخالفتوں کے اسباب | انقلاب کے بعد عیسائی قوم کا دل سلطنت کی طرف کھنچنے لگا مگر اس کے لیڈر اور ارباب کلیسا اسی طرح برگشتہ رہے۔ انھوں نے اپنی چھوٹی سی سلطنت الگ قائم کر رکھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شہرت کے حقوق سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر اس کے فرائض سے بچے رہیں۔

پہلا مناقشہ حکومت اور بطریق میں اس بات پر شروع ہوا کہ فوجی خدمت جس سے عیسائی صدیوں سے مستثنیٰ تھے اب ان پر بھی عائد کی گئی۔ پھر حکومت کے اس مطالبے پر جو بالکل بجا تھا کہ ان کے ابتدائی مدرسوں میں ترکی زبان سکھائی جائے، ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور یہ کہا جانے لگا کہ عیسائی زبردستی ترک بنائے جا رہے ہیں۔

غیر ترک مسلمان | عرب، البانی، کرد اور دوسری قوموں کے سردار اپنے جذبات اور اور اپنی اغراض دونوں کی بنا پر نئی حکومت کے مخالف تھے۔ حکومت نے سلطان کے اختیارات کم کر دئے اور ان لوگوں کو جو وابستگی تھی وہ سلطان ہی کی ذات سے تھی اس کی بدولت انھیں بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں اور ان کی قومیں محصولوں سے اور فوجی خدمت سے بچی ہوئی تھیں۔

ترک | خود ترک بھی نئی حکومت کے پوری طرح حامی نہ تھے ان میں جو قدامت پسند تھے وہ ارباب اتحاد وترقی کی انتہا پسندی سے بجا طور پر مخالف تھے اور مذہبی گروہ تو ہر طرح کے تغیر کا مخالف تھا خواہ وہ انقلاب سے ہو یا ارتقا سے۔

جاسوسوں کا گروہ | عبدالحمید نے جاسوسوں کا ایک لشکر رکھ چھوڑا تھا ان کی رپوٹوں کے دفتر سلسلہ ان کے یہاں ترتیب سے رکھے جاتے تھے ان میں پیشہ ور جاسوسوں کے علاوہ اور لوگوں کے پرچے بھی ہوتے تھے۔ جو انتقام کے جوش میں یا انعام کے لالچ میں اپنے ہمسایوں کی مخبری کرتے تھے غرض ان لوگوں نے ملک میں عجب ناپاک فضا پیدا کر رکھی تھی۔ انقلاب کے بعد یہ بے روزگاری اور ذلت کی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ مگر جب نوجوان ترکوں نے خفیہ رپوٹوں کے دفتر جلا ڈالے تب ان کی جان میں جان آئی۔ جب ان کی پچھلی زندگی کا سراغ مٹ گیا تو یہ لوگ انقلابی جماعتوں میں داخل ہوگئے اور وہاں بھی انھوں نے شبہات کی فضا پیدا کر دی اور جاسوسی کا رنگ جما دیا۔

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں کی سیرت | اسی طرح کی اندرونی مشکلات عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں کو بھی پیش آچکی تھیں۔ مگر ان میں اور اتحاد وترقی کے نوجوان ترکوں میں فرق تھا۔ اس فرق کو دو پہلوؤں سے دیکھنا چاہیئے۔ زمانے کے لحاظ سے اور اشخاص کی سیرت کے لحاظ سے۔

۱۸۶۵ء کے نوجوان ترک مغربی حریت کی تحریک سے، جو انقلاب فرانس کے بعد

پیدا ہوئی، متاثر تھے۔ نصب العین کی پرستش اس عہد کی نمایاں خصوصیت تھی۔ روسو کے "حقوقِ انسانی" کا روحانی اثر ابھی لوگوں کے قلوب سے زائل نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۰۸ء کے نوجوان ترک اس مادیت، اور واقعیت کے زمانے کی پیداوار تھے جو جنگ عظیم کی تمہید ثابت ہوا۔ روحانی ادب کا دور ختم ہو چکا تھا۔ رومان کا نام تک باقی نہ رہا تھا۔ تجارت کا دور دورہ تھا اور انسان کی زندگی کا مقصد دولت حاصل کرنا سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۳۹ء کے نوجوان ترک خواہ وہ مدبر ہوں یا انشا پرداز اعلیٰ درجہ کے شائستہ اور تربیت یافتہ لوگ تھے۔ وہ اپنے اعلیٰ نصب العین کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے انھیں عارضی اور فوری فوائد کی فکر نہیں تھی بلکہ مستقل اور دیرپا مقاصد کی۔ اس لئے وہ وسائل کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتے تھے جتنا نصب العین کو انقلابی طریقے اختیار کرنے کے بجائے وہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ تعلیم اور تلقین سے کام لیں خواہ اس میں کتنی ہی دیر کیوں نہ لگے وہ سب کے سب امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجے کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے۔ ابتدا میں ان میں ایک بھی شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانے کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ انمیں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی۔

جو وافعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ اس لئے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل بے تکلف اختیار کر لیتے تھے۔

جب ۱۹۰۹ء میں جماعت اتحاد و ترقی نے عثمان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو وہ اپنے آپ کو تنظیمات کے بانیوں کا جانشین سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مختلف قوموں کا اتحاد و مساوی نمائندگی، اور پارلیمنٹ کا نظام حکومت ایسی چیزیں ہیں جو دم بھر میں ملک کی حالت بدل دیں گی۔ مگر جب اسے اپنے مخالفوں سے سابقہ پڑا تو اس نے سختی سے کام لیا اور جو بیجا مراعات مختلف طبقوں اور جماعتوں کو حاصل تھی اس کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

ارباب اتحاد و ترقی سمجھتے تھے۔ کہ انھیں اندرونی اصلاحات میں مصروف دیکھ کر یورپ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا۔ یہ دھوکا انھیں یورپ کے اخباروں کی ہمدردی کی وجہ سے ہوا۔ سب سے زیادہ مدد کی توقع انھیں انگلستان سے تھی۔ کیونکہ تنظیمات کے بانی باوجود اس کے کہ وہ فرانسیسی تہذیب سے زیادہ متاثر تھے انگریزوں کے بڑے معترف تھے اور اُدھر عبد الحمید کو انگریزوں سے نفرت تھی۔ مگر ان کے ہاتھ میں حکومت آنے کے بعد کسی ملک کے باشندوں نے انکی اتنی مخالفت نہیں کی جتنی انگلستان کے اخباروں نے۔ ان معاہدوں سے قطع نظر کر کے، جو یورپ کی وزارتوں نے ترکوں کے خلاف کر رکھے تھے انگلستان میں تو رعایا بھی ترکوں کی ہمدرد نہیں تھی۔ آبرے ہربرٹ

نے سچ کہا ہے کہ گو انگلستان کی حریت پسند جماعت اصلاحات کو پسند کرتی ہے مگر اسے انقلاب سے نفرت ہے۔" نوجوان ترکوں کی مخالفت میں اتنی قوتیں جمع ہو گئی تھیں کہ اگر ان کے لیڈر ان بلند اصولوں پر جن کے وہ مدعی تھے، استقلال کے ساتھ عمل بھی کرتے تب بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ترکی کی تجدید کی کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ یورپ ترکی کو اپنے دست نگر کی حیثیت سے پسند کرتا تھا، مدمقابل کی حیثیت سے نہیں۔ ترکی عمال جو قدامت پسند تھے نوجوان ترکوں کے مخالف تھے اس لئے کہ یہ لوگ پرانے نظام کو قائم رکھنا نہیں بلکہ تجربے کرنا چاہتے تھے"۔

جماعت اتحاد و ترقی کے متعلق کسی غیر ملکی نے اتنی صحیح رائے قائم نہیں کی ہو گی جتنی یہ ہے۔

اس خوف سے کہ کہیں وطن کے پکے ترک سچ مچ اپنے ملک کو اس قدر قوی نہ کر دیں کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے یونہی رہ جائیں، غیر ملکی ریاستوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اندرونی تنظیم اور مدافعت کے مکمل ہونے سے پہلے جو کچھ ہاتھ لگے وہ لے بھاگیں۔

آسٹریا ہنگری نے بوسینہ کا صوبہ جو ۱۸۷۸ء سے ان کی حمایت میں تھا دبا لیا۔ کریٹ نے یونان سے الحاق کی خواہش کی۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ پہلے دو معاملے کم و بیش امن کے ساتھ طے ہو گئے۔ آخری معاملے میں سرکاری طور پر صرف احتجاج پر اکتفا کی گئی مگر غیر سرکاری طور پر بہت سے فوجی افسر اور ڈاکٹر

طرابلس پہنچ کر ان لوگوں کو مدد دینے لگے جو اٹلی کے حملے کی مدافعت کر رہے تھے۔ چنانچہ سب سے زبردست بیرونی معرکہ پیش آیا یعنی بلقان کی جنگ چھڑ گئی تو ترکی کے سب سے زیادہ بہادر اور من چلے لوگ ملک میں موجود نہ تھے۔

جنگ بلقان: جنگ بلقان گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی۔ دونوں کی طیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوولسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں کے ابتدائی حصے میں اس سے زیادہ قابل وزیر خارجہ دنیا کے کسی ملک میں نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آج دنیا میں جو ابتری نظر آتی ہے وہ اسی کی بدولت ہے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے ملک کا سچا خیرخواہ اور نہایت غیر معمولی قابلیت کا آدمی تھا

جنگ کے اسباب: روس نے ۱۹۰۵ء میں مشرق اقصے میں اپنے مقبوضات بڑھانے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا۔ اب اسوولسکی، جو مشرق اقصے کی طرف بڑھنے کا مخالف تھا وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ اسے اس بات پر اصرار تھا کہ روس بلقان میں پیش قدمی کرے اور آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے۔

باسفورس پر قبضہ کرنے کے لئے اسے برطانیہ عظمےٰ اور فرانس کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ انگلستان کو خوش کرنے کی غرض سے اس نے ۱۹۰۷ء میں جاپان سے صلح کرلی اور سارے جھگڑے جن میں چین کے اندر دائرہ اثر قائم کرنے کا مسئلہ بھی شامل تھا، طے کرلئے۔ اسی سال اس نے افغانستان، تبت اور

ایران کے بارے میں انگلستان سے معاہدہ کرلیا۔ افغانستان اور تبت کے متعلق تو یہ طے ہوا کہ ان سے تعرض نہ کیا جائے اور ایران دو دائروں میں تقسیم ہوگیا جن سے ایک میں روس کا اور دوسرے میں انگلستان کا اثر تسلیم کرلیا گیا۔ اس کے علاوہ روس انگلستان کی دوستی کی خاطر جرمنی کو ہر طرف سے گھیر لینے پر طیار ہوگیا۔ مگر اب بھی اسے آبنائے باسفورس کے بارے میں انگلستان کی رضامندی حاصل نہیں ہوئی آسٹریا کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے اسوولسکی نے ۱۹۰۸ء میں کاؤنٹ آرینتھال سے ملاقات کی اور اس سے یہ کہا کہ اگر آسٹریا روس کو آبنائے باسفورس پہ قبضہ کر لینے دے تو روس آسٹریا کا قبضہ بوسینیہ اور نووی بازار پر تسلیم کرے گا۔ آسٹریا کے وزیر خارجہ نے یہ تجویز اس شرط پر منظور کرلی کہ بلغاریہ اور رومانیہ کو بھی باسفورس میں حقوق دئے جائیں۔ اٹلی سے اسوولسکی نے طرابلس پر سودا کرلیا قبل اس کے کہ ان تجاویز کو اور ریاستیں منظور کریں۔ آسٹریا اور اٹلی نے اپنے اپنے حصّے کا ملک دبالیا۔

روس نے جب یہ دیکھا کہ انگلستان اور فرانس اس پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے کہ وہ آبنائے باسفورس پر قبضہ کرے تو اس نے ایک نئی چال سوچی۔ وہ یہ کہ بلقان کی ریاستوں کو اکسا کر ان کے توسط سے ترکوں کو بلقان سے نکال باہر کرے۔ اور اس کے بعد یورپ میں ایک بڑی لڑائی چھیڑ دے جس میں انگلستان اور فرانس کو بھی شامل ہونا پڑے اور اس طرح جرمنی اور آسٹریا کا جو اثر بلقان میں ہے وہ ختم ہوجائے۔ وہ جانتا تھا کہ جب ترک اور جرمن بلقان سے ہٹ جائیں گے تو وہ آسانی

سے آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرے گا۔

۱۹۱۰ء میں اسوولسکی نے وزارت خارجہ سے استعفا دے دیا اور سفیر بنا کر فرانس بھیج دیا گیا۔ وہاں اُس نے بڑی دانشمندی سے جنگ بلقان اور جنگ عظیم کی تحریک شروع کر دی۔

سب سے پہلے اس نے اتحاد بلقان کی تمہید اٹھائی۔ ۱۹۱۰ء میں عالمگیر سلافی اتحاد کی تبلیغ پر بہت زور دیا گیا۔ روس کے اہل علم کو یکایک مقدونیہ میں آثار قدیمہ اور دوسری چیزوں کی تحقیق کا شوق اٹھا اور اس پردے میں انھوں نے سرویہ کو بھڑکانا شروع کیا کہ آسٹریا ہنگری سے ملک چھین کر اپنے مقبوضات کو توسیع دے۔ اسی سال روس نے بلغاریہ سے خفیہ معاہدہ کیا جس کی پانچویں دفعہ یہ ہے :-

بلقان کی سلافی اقوام جن سے روس کو دلی تعلق ہے، اپنے اعلیٰ مقاصد اسی وقت حاصل کر سکتی ہیں جب وہ آسٹریا ہنگری اور جرمنی سے لڑیں اور اس لڑائی میں کامیاب ہوں۔

مارچ ۱۹۱۲ء میں اسوولسکی کی کوشش سے بلغاریہ اور سرویہ میں معاہدہ ہوا کہ دونوں مل کر ترکی کی مخالفت کریں گے۔ روس نے موسیو پوانکارے کو اس کی اطلاع کی اور کہا کہ ابھی اسے کسی شخص پر ظاہر نہ کیجئے گا۔ بلغاریہ کو اٹھارہ کرور فرانک سامان جنگ فراہم کرنے کے لئے قرض دیا گیا۔ اسی معاہدے کی ایک خفیہ دفعہ کے مطابق روس کو یہ حق دیا گیا کہ جب یہ جنگ بلقان جو اسی کی برپا کی ہوئی ہے ختم ہو، تو وہ ثالث

بن کر فیصلہ کرے۔

ادھر پردے کے پیچھے یہ طیاریاں ہو رہی تھیں اور اُدھر ترکی کی نئی حکومت کو ہر طرح سے اطمینان دلایا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں بلغاریہ اور سرویہ دونوں کے بادشاہ ترکی پہنچے اور انھوں نے باب عالی کو یقین دلایا کہ ان کے دل میں صلح و آشتی کے سوا کوئی خیال نہیں۔

اٹلی والوں نے ۱۹۱۰ء سربرآوردہ ترکوں کو اپنے ہاں بلوایا اور کہا کہ ہمیں ملک گیری کی ہوس نہیں ہے یہاں تک کہ اگر تم خود ہمیں طرابلس دینا چاہو تب بھی ہم نہ لیں گے۔ ان باتوں سے دھوکا کھا کر ترکی نے اپنی بہت سی فوجیں طرابلس سے یمن بھیج دیں جہاں شورش برپا تھی۔ جب اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا تب نوجوان ترکوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ یہ ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تمہید ہے مگر اس وقت ان کی اندرونی حالت بہت نازک تھی قدامت پسند گروہ ان کی انتہا پسندی سے تنگ آگیا تھا۔ حکمراں جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہوگیا۔ نئے انتخابات کے بعد ایک پرانا مدبّر کامل پاشا وزیر اعظم ہوگیا اس کی وزارت بے پارٹی کی کابینہ دیا کابینہ عظمیٰ کہلاتی تھی۔ فوج جس کی تنظیم اب تک محمود شوکت پاشا اور لائق نوجوان افسروں کے سپرد تھی بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی جو قابلیت میں ان سے بہت کم تھے اگرچہ بلقان سے خطرے کی خبریں برابر آرہی تھیں لیکن کامل پاشا کو پورا پورا بھروسا تھا کہ اُن دشمنوں

بلقان پر حملہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ خود پرانے طرز کے مدبروں میں سے تھا جو ہمیشہ سے انگلستان کی دوستی کے حامی تھے۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے، ۶ ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کر دیا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ جنگ چھڑ کر رہے گی تو یورپ کی ریاستوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ مگر بلقان کی ریاستیں ایسے اچھے موقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتی تھیں۔ یہ دیکھ کر کہ ترکی دہنے پہ آمادہ ہے پہلے مانٹی نگرو نے اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی نئے رنگروٹوں کی۔ بلغاریہ کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی، سرویہ کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار۔

جب جنگ شروع ہوئی تو مغربی ریاستوں نے یہ اعلان کیا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ اعلان اس خیال سے کیا گیا تھا کہ کہیں فتح ترکی کو نہ ہو جائے۔ مگر جب ترکی کو شکست ہوئی تو یورپ کے اخباروں نے وہ لہجہ اختیار کیا گویا یہ قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگ تھی جس میں صلیب ہلال پر غالب آئی۔

پہلے صلح نامے پر ۱۹۱۳ء میں لندن میں دستخط کیے گئے۔

ترکی سے جو مال غنیمت ملا وہ اتنا زیادہ تھا کہ بلقان کی ریاستیں اسے بانٹ کر نہ کھا سکیں۔ بلقان میں پھر جنگ چھڑ گئی جس میں بلغاریہ ایک طرف تھا اور بقیہ ریاستیں دوسری طرف۔ ترکوں نے موقع پا کر ایڈریانوپل پھر چھین لیا۔ اور دوسرے صلح نامے سے

جس پر اگست ۱۹۱۳ء میں بخارست میں دستخط کئے گئے جنگ کا خاتمہ ہوا۔ انگلستان اور فرانس نے معتدل رویہ اختیار کیا اور جرمنی نے مصلحت بینی سے کام لیکر آسٹریا کو جنگ میں شامل نہیں ہونے دیا۔ اس وجہ سے لڑائی بلقان ہی تک محدود رہی اور جنگ عظیم رک گئی۔

روس کو باسفورس نہیں ملا۔ اسے یقین ہوگیا کہ بلقان کے ذریعے سے اس کا ملنا محال ہے۔ یہ تدبیر تو ایسی الٹی پڑی کہ قریب تھا قسطنطنیہ بلغاریہ کو دیدیا جائے۔ معلوم ہوا کہ روس کا اصل مقصد حاصل ہونے کے لئے اس سے بڑی جنگ چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی اس جنگ میں اس کا فائدہ ہی ہوا۔ ترک بلقان سے نکل گئے سرویہ کے مقبوضات میں اضافہ ہوا، بلغاریہ کو جس نے اس کی پوری طرح اطاعت نہیں کی تھی، سزا مل گئی۔

جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات نہایت اہم تھے۔

(۱) ترکوں کی شکست سے مغربی ریاستوں کے خیالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہوا۔

(الف) روس ترکوں کے ہارنے سے خوش ہوا۔ مگر ان کا اس بری طرح ہارنا اس کی مصلحتوں کے خلاف تھا۔ جنگ بلقان کے آغاز کے وقت اسودلسکی نے لکھا تھا "ترکوں کی کامل شکست سے 'اتحاد' میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے" وہ ترکی سلطنت کا خاتمہ بلقان کی ریاستوں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ مغربی ریاستوں کے ہاتھ سے چاہتا تھا۔

(ب) بلغاریہ والوں کی قابلیت اور منچلے پن سے بھی روس کو اندیشہ پیدا ہوگیا اس کی اور فرانس کی نظرِ عنایت اب سرویہ کی طرف زیادہ ہوگئی۔ اور وہی آسٹریا کی سلطنت کا وارث قرار دیا گیا۔ بلغاریہ کی طرف سے شبہ تھا کہ وہ آسٹریا سے ساز باز رکھتا ہے۔

(ج) فرانس اور انگلستان کو ترکی کی تباہی کا یقین ہوگیا۔ اس کی اہمیت ان کی نظر میں فوجی قوت کی وجہ سے تھی۔ اب انھیں اس سے مدد ملنے کی امید نہیں رہی اور انھوں نے یہ خیال چھوڑ دیا کہ اس سے بین الاقوامی ریاست کے کھیل میں مہرے کا کام لیں۔

۲۔ ترکوں پر اس شکست کے جو اثرات ہوئے وہ اس سے بھی زیادہ گہرے تھے۔

(الف) شکست کی بڑی وجہ یہ تھیں۔ کامل پاشا کا ضعف جو بڑھاپے میں پیدا ہوگیا تھا اس کی خود بینی اُس کا مغرب کی ریاستوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرنا جس کی وجہ سے اُس نے اپنی آزمودہ کار فوج کو منتشر کر دیا، پرانے طرز کے افسروں کی عام نااہلی اور بے تدبیری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پرانے لوگ سپاہی اور مدبر دونوں کی حیثیت سے بے وقعت ہوگئے۔

(ب) شکست کی مصیبت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلغاریوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے

تھے قتل کرنا شروع کیا اور یہ لوگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے۔ اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فانوں مارنا۔ ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہچانا اور ان کا خون بہانا ان سب چیزوں کی ابتدا زمانۂ حال کی لڑائی میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں کی۔

(ج) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی۔ دوسری جنگ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لئے بھیجا۔

جب ترکی عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہوکر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کیا تھا کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا۔ ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی اور عیسائیوں کو اسی حالت میں دیکھ کر یہ جوش و خروش تو ان پر بہت برا اثر ہوا مقدونیہ سے ہزارہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آتے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے۔ اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جواب تک بہت اچھے تھے، بہت خراب ہوگئے۔

(د) ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس مصیبت میں سلطنت کی مسلمان رعایا میں باہمی ہمدردی اور محبت بڑھ جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے ملکوں کے مسلمان بھائیوں کے

ہم بیحد احسان مند ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہر ممکن طریقے سے مدودی اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ مگر سلطنت کے اندر مسلمانوں میں تفرقہ کا رجحان اور بھی قوی ہو گیا۔

جنگ بلقان اور اس کے اثرات کی یہ تصویر پیش نظر رکھ کر نوجوان ترکوں پر نااہلی کے دو بڑے الزام عائد ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیرونی اور اندرونی پالسی کے انتخاب میں سیاسی ترقی کے دو عمدہ موقعے کھو دیئے۔

اندرونی پالسی:- جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ عثمانی سلطنت جتنی اب رہ گئی ہے اُس کا قائم رہنا بھی دشوار ہے وہ اگر اپنے بیشمار دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی تھی تو صرف اسی صورت میں کہ ترکوں اور عربوں میں اتحاد ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں میں قومیت کی تحریک سرایت کر چکی تھی مگر کہا جاتا ہے کہ محمود شوکت پاشا نے، جو خود عربی نسل سے تھے، یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربوں اور ترکوں کی ایک متحدہ شاہی حکومت قائم کی جائے اور اس کا دارالسلطنت حلب کو قرار دیا جائے۔ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے مسلمانوں کا باہمی نفاق دور ہو جاتا مگر اس کا تجربہ ضرور کرنا چاہیئے تھا۔

بیرونی پالسی اس عالمگیر سلافی اتحاد کے مقابلہ میں جس کا پشت و پناہ روس تھا، نوجوان ترکوں کو بلقان کی غیر سلافی قوموں خصوصاً یونانیوں کی ناہیف ولوب کر کے ان سے کام لینا چاہیئے تھا۔ موسیو وینی زیلاس کے اعلانات جو جنگ بلقان سے پہلے کئے

گئے اور عزت پاشا کی تزک جو اس کے بعد شائع ہوئی، دونوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ تھوڑی سی قربانی سے یہ چیزیں حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اگر نوجوان ترک یہ کر گزرتے تو بلقان میں جو مصیبت پیش آئی اس میں کچھ تخفیف تو ضرور ہو جاتی۔ بعد کے واقعات شاہد ہیں کہ مشرق ادنےٰ میں سیاسی قوت کا توازن قائم رکھنا لازمی ہے اور اس کی یہی صورت ہے کہ ایک طرف سلافی اقوام ہیں اور دوسری طرف غیر سلافی اقوام ہیں باہم اتفاق رہے۔ مگر نوجوان ترکوں نے اس معاملے میں بھی غفلت کی۔

سب سے اہم تغیر جو اس زمانے میں خود ترکوں کے اندر رونما ہوا یہ تھا کہ ان میں بھی قومیت کی تحریک پھیل گئی۔ اس تحریک کے ادبی مظاہر کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں تو ہم اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ جنگ بلقان کے بعد سلطنت عثمانی کے عنصر نے ایک بالکل نئی حیثیت اختیار کرلی سلطنت تو اب کوئی دم کی مہمان تھی اس "مرد بیمار" کی آخری اولاد وہ تھی جو آگے چل کر ترکی ریاست کہلائی۔ باپ بوڑھا اور کمزور تھا مگر بچہ غضب کا مضبوط نکلا

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں کی تاریخی تنقید بہت مشکل ہے۔ کیونکہ نہ تو ان کی اندرونی پالیسی میں یک رنگی پائی جاتی تھی اور نہ بیرونی پالیسی میں۔ سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ ہم ان کے خیالات اور نظریات کے مختلف عناصر پر الگ الگ غور کریں۔ ان کے زمانے میں سیاسی، معاشرتی اور تمدنی تحریکوں کی گرم بازاری تھی اور انھوں نے

ان تینوں کا تجربہ کیا۔ اس وقت ہم صرف ان تحریکوں کے سیاسی پہلو کا ذکر کریں گے اور دوسرے پہلوؤں پر آگے چل کر ترکی ادب کی بحث کے سلسلہ میں نظر ڈالیں گے

قومیت اس تحریک کو جنگ بلقان کے دو نتیجوں سے مدد ملی۔ (۱) اب ملک میں عیسائیوں کی اکثریت باقی نہیں رہی۔ (۲) عرب جن کی تعداد سلطنت کی تمام رعایا میں سب سے زیادہ تھی رفتہ رفتہ الگ ہو رہے تھے۔ غرض انتشار کے آثار نمایاں تھے اور ترک اس پر مجبور تھے کہ وہ اپنی تنظیم ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے کریں۔ دوسری قوموں سے انھیں کوئی پرخاش نہ تھی عربوں سے جو سلطنت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتے تھے وہ سمجھوتا کرنے کو تیار تھے۔ مگر حکمراں طبقہ ان سے کھٹکتا تھا۔ جوں جوں قومیت کی تحریک پھیلتی جاتی تھی، ترکی حکومت کی بدگمانی اس کی طرف سے بڑھتی جاتی تھی۔ بڑے سیاسی لیڈروں میں بہت کم اس کے حامی تھے

عالمگیر اسلامی اتحاد اس تحریک کا روح رواں انور پاشاہ تھا۔ اور خود نوجوان ترکوں کی پارٹی اسے چلاتی تھی۔ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ اس کا سیاسی مقصد کیا تھا۔ ایک مبہم سی بات یہ کہی جاتی تھی کہ وہ تمام مسلمانوں کو خلیفہ اسلام کے زیر سایہ متحد کرنا چاہتی ہے۔ جغرافی حیثیت سے تو یہ چیز بالکل ناممکن تھی وہ اگر کامیاب ہو سکتی تھی تو صرف ایک روحانی تعلیمی اور اخلاقی قوت کی حیثیت سے۔ مگر افسوس ہے کہ اس مقصد کو اس نے پیش نظر نہ رکھا۔ رہی سیاسی قوت تو وہ اسے کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ جب خلیفہ نے جنگ عظیم کے زمانے میں جہاد کا اعلان کیا تو اس کا مطلق کوئی

اثر نہیں ہوا۔ برادران اسلام ترکوں سے بدستور جنگ کرتے رہے۔ عالمگیر اسلامی اتحاد کی تحریک کو جرمنی نے اپنی بساط سیاست کا ایک مہرہ بنا رکھا تھا اور اتحادی اس سے کھٹکتے تھے۔ مگر خود ترکوں کی قوم پرور جماعت اس کے سیاسی پہلو کی مخالف تھی۔

عالمگیر تورانی اتحاد:۔ یہ نوجوان ترکوں کا خاص سیاسی نصب العین تھا۔ اس تحریک کی قیادت بھی انور پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان ترکوں سے جو روسی حکومت میں رہتے ہیں، اتحاد کی کوشش کی جائے۔ یہ روسیوں کے عالمگیر سیاسی اتحاد کا جواب تھا۔ اس کے تمدنی پہلو کا ذکر ہم ادب کے سلسلے میں کریں گے مگر سیاسی حیثیت سے یہ بڑی خطرناک چیز تھی۔ اس کے علاوہ جغرافی اعتبار سے اسلامی اتحاد کی طرح اس کی کامیابی کا امکان بھی بہت محدود تھا۔ ادھر نوجوان ترک ان تینوں سیاسی نظریوں کے متعلق قیل و قال اور تجربے کر رہے تھے اور ادھر قومیت کی تحریک جس کے مقاصد بہت مختصر اور محدود تھے، پرامن طریقے سے پھیلتی جاتی تھی۔ نوجوان ترکوں نے اس زمانے میں بہت سی مفید اصلاحیں کیں جو آگے چل کر ایک جدید ریاست کا نظام قائم کرنے میں بہت کام آئیں۔

معاشی بیداری۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں غیر ملکیوں کے مخصوص حقوق منسوخ کر دیئے گئے۔ یہیں سے ترکی کی معاشی بیداری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد حکومت نے اور معاشی اصلاحات کی طرف بھی قدم بڑھایا۔

کھانے پینے کی اور دوسری قسم کی چیزیں جو ترکی میں پیدا ہوتی تھیں چنگی سے بری کر دی گئیں۔ اس سے ترک کاشتکار اس قدر خوش حال ہو گئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔

۱۹۱۶ء میں ایک نیا قانون بنایا گیا جس کی رو سے غیر ملکی کمپنیاں اس پر مجبور کی گئیں کہ اپنا کاروبار ترکی زبان میں کریں۔ اس سے ترک نوجوانوں کے لئے معاشی جد وجہد کی نئی راہ کھل گئی۔ اس سے پہلے یہ کمپنیاں یا تو غیر ملکیوں کو نوکر رکھتی تھیں یا عیسائیوں کو جو غیر زبانیں جانتے تھے۔

پیشوں کی تعلیم خصوصاً تجارت کی تعلیم میں بہت ترقی ہوئی۔ مختلف پیشوں کی تعلیم گاہیں اور صنعت و حرفت کے مدارس کھولے گئے۔ بہت سے لڑکے یورپ کے ملکوں میں، جن سے دوستانہ تعلقات تھے، اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہاں کارخانوں میں کام سیکھیں اور تربیت یافتہ مستری اور مزدور بن کر ترکی کی صنعت کو ترقی دیں۔

پہلا ترکی بنک کھولا گیا جس نے ملک کے مالی کاروبار کا بہت بڑا حصہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ان سب کاموں میں جرمنوں کی نگرانی کی بدولت اس قدر عمدگی اور باقاعدگی پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے ترکی میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

اسی زمانہ میں امداد باہمی کی انجمنیں اور پیشہ وروں کی انجمنیں بھی قائم کی گئیں۔

قدیم ترکوں کے ہاں جو پیشہ وروں کی برادریاں ہوتی تھیں وہ ان انجمنوں کے ذریعہ نئے سرے سے زندہ ہوگئیں۔ امید تھی کہ یہ انجمنیں جدید ترکی کی زندگی کا ایک اہم عنصر ثابت ہوں گی۔ مگر بدقسمتی سے ان کے قائم کرنے والے ایک خاص پارٹی کے لوگ تھے۔ اس لئے ۱۹۱۸ء میں جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئی تو یہ سارا نظام سلطان کے حکم سے درہم برہم کر دیا گیا۔

مگر عام معاشی بیداری نے زمانہ جنگ کی حکومت کو بھی اس پر مجبور کیا کہ وہ ایک اقتصادی پالیسی ترتیب دے۔ اس پالیسی کا رجحان یہ تھا کہ ملک کی معاشی زندگی پر حکومت کی نگرانی ہو مگر حکومت کی نگرانی کا نتیجہ خصوصاً جنگ کے زمانے میں یہ ہوتا ہے کہ تجارت اور صنعت پر ایک پارٹی کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے یہی ترکی میں بھی ہوا۔

معاشی بیداری کا سب سے مفید اور دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس کی وجہ سے آبادی کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ اور اس کا غور سے مطالعہ کیا گیا۔ لڑائی، بیماری اور بچوں کی بڑھی ہوئی شرح اموات کی وجہ سے آبادی اتنی کم ہوگئی تھی کہ ترکوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھیں اپنی غیر محدود قوت کا جو گھمنڈ تھا وہ دور ہوگیا۔ اور اب حفظان صحت کی طرف سے وہ اگلی سی بے توجہی باقی نہیں رہی۔ ان کو آج تک اپنی کمزوری کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوا۔ حکومت نے تپ دق اور ملیریا کے انسداد، بچوں کے حفظان صحت اور خدمت خلق کے مختلف کاموں کے لئے انجمنیں

قائم کیں۔ ترکی نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس کا سب سے کمزور پہلو آبادی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ترکی کی آیندہ ترقی کے لیے یہ دو چیزیں ناگزیر ہیں ایک تو یہ کہ اسے ایک عرصہ تک امن نصیب ہو اور دوسرے یہ کہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو ترکی میں آباد کرنے کے لئے عمدہ قانون بنایا جائے۔ البتہ جو لوگ آباد کئے جائیں ان کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو ان کی وجہ سے سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔

تعلیمی اصلاحات | نوجوان ترکوں کا سب سے بڑا اور سب سے پائدار کارنامہ ان کی تعلیمی اصلاحات ہیں۔ تعلیم عامہ کا جو نظام آج کل موجود ہے وہ انھیں کا قائم کیا ہوا ہے۔

یونیورسٹی | قسطنطنیہ کی یونیورسٹی عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں نے قائم کی۔ مگر عبدالعزیز نے اسے بند کرا دیا۔ اس کی حکومت کے آخر زمانے میں دینیات اور سائنس کے شعبے کھول دیے گئے مگر حقیقی معنوں میں یونیورسٹی اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے قائم کی جرمنی سے ۱۹ پروفیسر بلائے گئے جن میں سے بعض علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے اسسٹنٹ ترک تھے جنھوں نے جرمن یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ نوجوان ترکوں کی دس سال کی حکومت میں یونیورسٹی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اس کا سب سے زیادہ قابل قدر کام یہ تھا کہ اس نے بہت سی کتابیں شائع کیں جن میں سے اکثر سائنس، تاریخ اور ادب کی کتابوں کے ترجمے تھے۔ تالیف اور ترجمہ کے لئے ایک

علیحدہ انجمن قائم تھی جس نے بڑی مفید خدمت انجام دی۔ تاریخی اکادمی نے عثمانی تاریخ کے متعلق بہت قابل قدر تحقیقات کی۔

ابتدائی اور ثانوی مدارس خصوصاً ماڈل اسکولوں کی تعداد میں بہت ترقی ہوئی۔ ایک نہایت اہم اور مفید کام شیخ الاسلام خیری آفندی نے شروع کیا۔ اس نے دارالسلطنت کے ان مکتبوں کی، جو مساجد سے متعلق تھے، نئے سرے سے تنظیم کی اور ان میں جدید طرز تعلیم کو رواج دیا اس نے ایک جدید طرز کا بڑا مدرسہ یا کالج بھی قائم کیا جس میں سائنس اور تاریخ کی تعلیم کے لئے بہت قابل معلم رکھے گئے کچھ دن بعد ان مکتبوں پر محکمہ تعلیمات نے قبضہ کرلیا اور وہ کالج شیخ الاسلام کے مستعفی ہوجانے کے بعد توڑ دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو دو کروڑ تیس لاکھ کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فیصدی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جب وہ حکومت سے علیحدہ ہوئے تو ایک کروڑ چالیس لاکھ کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بیس فیصدی تک پہنچ گئی تھی۔

فوج اور مالیات میں بڑے زبردست تغیر واقع ہوئے۔ فوج جرمن ماہروں کی مدد سے انور پاشا کی اعلیٰ تنظیمی قابلیت کی بدولت بالکل جدید طریقے پر مرتب ہوگئی۔ وزارت داخلہ میں اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی گئی مگر سیاسی مداخلت نے اس میں اس قدر روڑے اٹکائے اور اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی

خارجی پالیسی | ۱۹۱۳ء کے بعد سے نوجوان ترکوں نے سیاسی صورت حال سمجھنے

میں بڑی پختہ کاری کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اس بات کا اچھی طرح اندازہ کرلیا کہ مغربی ریاستیں مشرق ادنیٰ کی تجارت میں ایک دوسرے کی حریف ہیں اور ان کی مخالفت سے فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے بڑی دانشمندی سے تجارتی حقوق مختلف ریاستوں میں تقسیم کردیئے۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان روس اور فرانس اور انگلستان سے ترکی ریلوے خصوصاً بغداد ریلوے کے متعلق معاہدے کئے گئے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی باہمی تجارتی رقابتوں کی وجہ سے ترکی ان کے شر سے محفوظ رہے گا۔

۱۹۱۴ء میں ترکی نے یہ کوشش کی کہ روس سے جو قدیم عداوت چلی آتی ہے اس میں کچھ کمی ہوجائے۔ ایک مہم لیویڈیا میں زار کے پاس بھیجی گئی اور ترکوں اور روسیوں کی ایک متحدہ انجمن استنبول میں قائم کی گئی۔ ترکی اخباروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ آبنائے باسفورس روسیوں کے لئے کھول دیا جائے۔ اسی طرح فرانس اور انگلستان سے بھی اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

یونان سے بھی نوجوان ترک سمجھوتا کرنا چاہتے تھے ان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ یونان کی مسلم ترکی رعایا کا مبادلہ ترکی کی یونانی رعایا سے کرلیا جائے تاکہ مقدونیہ میں یونان اور ترکی کی مخالفت کا خاتمہ ہوجائے۔

غرض ۱۹۱۴ء تک نوجوان ترک ان سب معاملات کو جوان کے لئے خطرناک تھے اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور اگر انھیں کچھ دن اور امن نصیب ہوتا اور جنگ عظیم نہ چھڑ گئی ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ مسئلہ جسے اہل یورپ مشرقی مسئلہ کہتے ہیں صلح و آشتی

کے ساتھ حل ہوجاتا۔

جنگ عظیم جنگ عظیم وہ چیز تھی جس نے انسانی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ مشرق اور مغرب دونوں پر اس کا زبردست اثر پڑا اور ابھی تک برابر پڑ رہا ہے خواہ اس امر میں کتنا ہی اختلاف ہو کہ اس کے اسباب کیا تھے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے مگر اس پر سب متفق ہیں کہ جنگ کے بعد سے دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ہر شخص کو جو تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے یہ چاہئے کہ اس دور کے مختلف خیالات اور مختلف قوتوں کی باہمی کشمکش پر غور کرے اور ان میں سے وہ عناصر منتخب کرے جو پائدار اور مفید ہیں۔ ان لوگوں کو جو آگے چل کر اپنی قوم کے سیاسی لیڈر بننے والے ہیں جنگ عظیم اور اس کے اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ ان کی قوم زندگی کی کشمکش میں سلامت رہ سکے۔ خصوصاً بین الاقوامی سیاست کے ارباب عمل اور ارباب نظر کو، اگر دنیا میں کامل امن قائم کرنا منظور ہے تو انھیں چاہیئے کہ اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ کیا اچھا ہو اگر ہر یونیورسٹی میں جنگ عظیم کی تاریخ کا ایک خاص پروفیسر مقرر کردیا جائے یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ترکی کا حصہ جنگ عظیم میں کیا تھا۔ آیا وہ جنگ کا بانی تھا یا خود بنائے مخاصمت تھا۔

جنگ کے اسباب اور اس کی ذمہ داری جنگ عظیم کے حقیقی اسباب کا سلسلہ یورپ کی قدیم تاریخ میں شارلیمین کے زمانے سے شروع ہوجاتا ہے پروفیسر فے نے اپنی کتاب "بنائے جنگ" میں جو جنگ عظیم کے متعلق سب سے مکمل اور مستند کتاب ہے

لکھا ہے" یہ بین الاقوامی فتنہ ریاستوں کی جتھے بندی، سامان جنگ کی افراط اور پوشیدہ ڈپلومیسی کا نتیجہ ہے" ابھی تک جنگ کے اسباب کے متعلق کافی معلومات بہم نہیں پہنچی ہے اور پھر مورخ بھی اپنے جذبات پر اس قدر قابو حاصل نہیں کر سکے ہیں کہ واقعات کو خالص علمی نظر سے دیکھیں اور بے لاگ رائے دے سکیں کہ" یہ بین الاقوامی فتنہ سامان جنگ کی افراط اور پوشیدہ ڈپلومیسی" کن اسباب پر مبنی ہے ۔ بہر حال اس وقت تک جو تحقیق ہو چکی ہے اس کا لب لباب یہ ہے :-

۱۔ سیاسی اسباب میں سب سے اہم سلافی اقوام اور جرمن اقوام کی باہمی رقابت تھی ۔ دونوں بلقان اور مشرق ادنیٰ یعنی ترکی میں اپنا اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی تھیں۔

۲۔ معاشی اسباب میں تجارتی مقابلہ، دنیا کے بازار پر قبضہ کرنے کی کوشش اور نو آبادیاں حاصل کرنے کی خواہش سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔

۳۔ جذباتی اسباب میں آلساس اور لورین کا جھگڑا تھا ۔ جو جرمنی اور فرانس میں صدیوں سے چلا آتا تھا ۔

جن واقعات کی وجہ سے جنگ چھڑی ان سے روس اور جرمنی کو براہ راست تعلق تھا ۔ انگلستان کو تجارتی رقابت اور فرانس کو جذباتی رقابت کی وجہ سے جنگ میں شامل ہونا پڑا۔

جرمنی کی صورت حال یہ تھی :-

۱۸۷۱ء میں جرمنی کی آبادی ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی اور اس کے لئے خوراک بہم

پہنچانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی ۔ ۱۹۱۴ء میں اس کی آبادی ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ظاہر ہے کہ اب خوراک کا مسئلہ اور بھی نازک ہوگیا تھا ۔

جرمنی کو ہر سال ۱۰ کروڑ مارک (تقریباً ساڑھے سات کروڑ روپیہ) کا غلہ اور دوسری اشیاء خوردنی باہر سے منگانی پڑتی تھیں ۔ اس کی وجہ اس کی درآمد کی مقدار سال بھر میں برآمد کے برابر ہو جاتی تھی ۔ اس لئے اس کی زندگی کا دار و مدار اس پر تھا کہ اپنی تجارت کو ترقی دے نوآبادیاں حاصل کرنے کا اس کے لئے کوئی موقع نہ تھا اس لئے کہ مشرق کے محدود رقبہ میں مغربی ریاستیں پہلے ہی سے اپنی اپنی نوآبادیاں قائم کر چکی تھیں ۔ تجارتی بازاروں پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا تھا ۔

نوآبادیوں کی طرف سے مایوس ہو کر جرمنی نے یہ کوشش کی کہ ایشیائے کوچک کے بازار کو اپنے ہاتھ میں لے لے ۔ اس نے بغداد ریلوے کی تعمیر اس غرض سے شروع کی تھی کہ ترکی اقتصادی ترقی کے بلند مدارج پر پہنچ جائے اور جرمنی کا مال زیادہ خرید سکے ۔

اس سے انگلستان کو جو تجارت میں جرمنی کا رقیب تھا بہت اندیشہ پیدا ہوگیا روس اس وجہ سے بھڑک گیا کہ بغداد ریلوے کے کھل جانے کی وجہ سے ایسے آثار نظر آرہے تھے کہ ترکی بہت ترقی کر جائے گا اور روس کے لئے اس پر حملہ کرنا اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا بہت دشوار ہو جائے گا ۔

۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان نوجوان ترکوں نے اس بات کی کوشش کی کہ

غیر قوموں کی تجارتی رقابت سے فائدہ اٹھا کر اپنی حفاظت کا سامان کریں اور میرے خیال میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہے۔ مگر روس کے دل سے آبنائے باسفورس اور استنبول پر قبضہ کرنے کا خیال کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ترکی کو پہنچنے سے پہلے ہی کچل ڈالے۔ اس غرض سے اس نے لڑائی کی آگ بھڑکانے میں جلدی کی کہ جرمنی کا زور ٹوٹ جائے اور باسفورس میں اس کے لئے میدان صاف ہو جائے۔

اس بات کے بہت قوی شبہات موجود ہیں کہ سراجیوو کے المناک حادثہ میں روس کے گرگوں کا ہاتھ تھا سرویہ کے ایک مصنف بوگا چوچوز نے اپنی کتاب "جنگ کے اسباب" میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ولی عہد آسٹریا کے قتل کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ جنھوں نے جنگ بلقان سے قبل اسوولسکی کے اشارہ سے سرویہ کی توسیع کی تحریک اٹھائی تھی۔ آسٹریا اس جال میں پھنس گیا۔ انگلستان اور فرانس ان معاہدوں کی وجہ سے جو پہلے کر چکے تھے سرویہ کی مدد پر مجبور ہو گئے۔ اس ذرا سی چنگاری نے ساری دنیا میں آگ لگا دی۔ جنگ عظیم برپا ہو گئی۔ ترکی کو جو بنائے مخاصمت تھا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔

خارجی پالیسی۔ ترکوں نے جرمنی سے دوستی کرنے کی پالیسی اس وجہ سے اختیار کی تھی کہ اسے اوروں کے مقابلہ میں جرمنی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ کم تھا۔ مگر ترک اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اتحاد ثلاثہ کی قوت بہت زبردست ہے۔ نوجوان ترکوں کا اعتدال پسند عنصر اور ملک کی رائے عامہ اتحادیوں کی طرف مائل تھی۔ اس لئے ترکی نے

پہلے انتہائی کوشش کی کہ اتحادی اسے اپنے ساتھ شریک کرلیں مگر ان کی حالت یہ تھی کہ وہ بلقان کی ریاستوں کو ہر طرح کے وعدے کرکے اپنا طرفدار بنانا چاہتے تھے مگر ترکی کے اظہار نیازمندی پر انھوں نے مطلق اعتناء نہ کی ان کے اس رویہ میں اس شکست کو بہت کچھ دخل ہے جو ترکوں نے بلقان میں اٹھائی تھی۔ ترکی کی فوجی قوت کو وہ حقیر سمجھنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ روس نے جو اتحادیوں میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا لڑائی چھیڑی ہی اس غرض سے تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کرلئے جائیں۔

نوجوان ترکوں کی ایک چھوٹی سی جماعت جس میں زیادہ تر فوج کے لوگ تھے جرمنی سے اتحاد کرنے کے حامی تھی۔ اس کا ابتدا ہی سے یہ خیال تھا کہ جس فریق میں روس شامل ہے اس کا ساتھ ترکی ہرگز نہیں دے سکتا جنگ سے کچھ دن پہلے جرمنی بھی ترکی کی نسبت بلقان کی ریاستوں کی طرف زیادہ مائل تھا۔ مگر جب لڑائی سر پر آ پہنچی تو اس نے ترکی سے یہ معاہدہ کرنا چاہا کہ دونوں ایک دوسرے کو مدافعت میں مدد دیں گے اور ترکی نے منظور کرلیا ۳۱۔ جولائی ۱۹۱۴ء کو اس معاہدے پر دستخط ہوگئے۔

معاہدے میں تین دفعات ایسی تھیں جن سے دونوں فریقوں کی ذہنیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ دونوں فریق وعدہ کرتے ہیں کہ آسٹریا اور سرویہ کی موجودہ لڑائی میں بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی اور جرمنی دونوں یہی چاہتے تھے کہ موجودہ جنگ ایک محدود خطہ کے باہر نہ پھیلنے پائے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر روس جنگ میں شامل ہوگیا تو دونوں کے لئے خطرہ کا باعث ہے۔ اس لئے معاہدے میں دوسری دفعہ یہ رکھی گئی۔

"اگر روس نے مداخلت کی اور اپنی فوجوں سے کام لیا اور جرمنی کو سابقہ معاہدے کے مطابق آسٹریا کا ساتھ دینا پڑا تو ترکی کو بھی اپنا وعدہ پورا کرنا پڑے گا۔"

مگر وہ پھندا جس میں ترکی بے سمجھے بوجھے پھنس گیا چوتھی دفعہ میں ہے۔

"اگر روس نے ترکی مقبوضات پر حملہ کیا تو جرمنی ان کی مدافعت میں مدد دے گا۔ اور اگر ضرورت پڑی تو اپنی فوجوں سے کام لے گا۔"

اس معاہدے کا علم صرف تین آدمیوں کو تھا یعنی انور پاشا، طلعت پاشا، اور سعید پاشا کو۔ جب مجلس وزرا کو اس کی اطلاع دی گئی تو اعتدال پسند فریق نے اس کی مخالفت کی یہاں تک کہ بعض نے استعفا دے دیا۔

جرمنی سے یہ خفیہ معاہدہ کرنے کے بعد انور پاشا نے روسی سفارت خانہ میں جاکر کہا کہ ہم لڑائی میں روس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ ہم آسٹریا پر حملہ کریں گے۔ اور بلقان کی جو ریاستیں روس کی مخالف ہیں ان کی راہ روکے رکھیں گے۔ اس کے عوض میں وہ یہ چاہتا تھا کہ بلقان کا نقشہ بدلتے وقت ترکی کا خیال رکھا جائے روس نے اس وقت انکار تو نہیں کیا مگر اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے

یہ تجویز کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ انور پاشا کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکی کا دامن بھی اس خفیہ ڈپلومیسی سے آلودہ ہوچکا تھا جس کا یورپ میں زور تھا، اور جس نے یہ مہلک نتائج پیدا کئے۔ اب معلوم نہیں کہ انور پاشا کا مقصد اس گفت وشنید سے مہلت حاصل کرنا تھا یا وہ واقعی روس سے مفاہمت کی آخری کوشش کر رہا تھا بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ فوجی پارٹی اس کا تہیہ کرچکی تھی کہ خواہ ایک فریق کی طرف سے خواہ دوسرے کی طرف سے جنگ میں ضرور شریک ہوجائے۔ وہ ترجیح اسی کو دیتی تھی کہ اتحادیوں کا ساتھ دے۔ اس میں کچھ ضرورت کا تقاضا تھا اور کچھ جذبات کا ایک تو وہ بلقان کی شکست کا داغ مٹانا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ جانتی تھی کہ ترکی کا جنگ سے بچنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اگر اتحادیوں کو فتح ہوئی تو روس آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

جن لوگوں کی اس زمانہ میں یہ رائے تھی کہ ترکی جنگ سے علیحدہ رہ سکتا تھا اور اسے یہی کرنا چاہئے تھا انھیں آیندہ واقعات کو دیکھ کر اپنا خیال بدلنا پڑا۔ بہرحال اس وقت تو صلح کی پارٹی نے انتہائی کوشش کی ترکی جنگ میں شریک نہ ہو۔ مگر ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس کا پہلے سے خیال بھی نہ تھا۔ جرمنی کے دو جنگی جہاز بحر اسود میں موجود تھے۔ انھیں ترکی حکومت نے خرید لیا تھا۔ مگر ان کی کمان اب تک جرمن بحری افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان جہازوں نے روس کے جہازوں پر گولہ باری شروع کردی۔ ۴۔ نومبر کو روس نے اور ۵۔ نومبر کو انگلستان اور فرانس نے ترکی سے

اعلان جنگ کر دیا

ترکی نے جنگ عظیم میں جو کچھ کر دکھایا اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔
ظاہر ہے کہ جب جرمنی نے ترکی کے ساتھ خفیہ معاہدہ کیا تھا تو اسے ترکوں کی فوجی قوت سے اتنی امید نہ تھی جتنی عالمگیر اسلامی اتحاد اور عالمگیر تورانی اتحاد کے اثر سے تھی۔
وہ سمجھتا تھا کہ جب خلیفہ اسلام جرمنی کا طرفدار ہوگا تو اتحادیوں کو اپنی مسلمان رعایا سے کوئی مدد نہ ملے گی مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ عالمگیر تورانی اتحاد کی تحریک جس سے یہ توقع تھی کہ روس میں انتشار پیدا کر دے گی بہت کمزور نکلی۔ اگر جرمنی کو جنگ میں فتح ہوتی تو شاید اس تحریک سے کچھ کام نکلتا مگر موجودہ صورت میں تو اس سے نہ تو جرمنی کو کچھ مدد ملی اور نہ ترکی کو۔ البتہ اس کی تلافی اس طرح سے ہو گئی کہ ترکی کی فوج نے وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

جب ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو اتحادیوں کے اخبارات بہت خوش تھے انھیں یقین تھا کہ تین مہینے کے اندر ترکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔
اور اتحادی ریاستیں اس کے حصے بخرے کر لیں گی۔ اسی وجہ سے ان ریاستوں وہ انھی
نے پوری طاقت سے دردانیال پر حملہ کر دیا۔ یہی لڑائی کا سب سے اہم ثابت ہونے کے بعد
دردانیال کا معرکہ دنیا میں یادگار رہے گا۔ ترکی کا دردانیال کو
دشمن ہونا پڑا۔
سے محفوظ رکھنا اور دوسرے مقامات پر بھی جرمنی کے ہتھیار
ڈالنے دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ہم
میدان سے قدم نہ ہٹانا جنگ عظیم کے اہم ترین
دنوں میں مشرق اور مغرب کی کشمکش نے

یہ تجویز کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ انور پاشا کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکی کا دامن بھی اس خفیہ ڈپلومیسی سے آلودہ ہو چکا تھا جس کا یورپ میں زور تھا، اور جس نے یہ مہلک نتائج پیدا کیے۔ اب معلوم نہیں کہ انور پاشا کا مقصد اس گفت وشنید سے مہلت حاصل کرنا تھا یا وہ واقعی روس سے مفاہمت کی آخری کوشش کر رہا تھا۔

بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ فوجی پارٹی اس کا تہیہ کر چکی تھی کہ خواہ ایک فریق کی طرف سے خواہ دوسرے کی طرف سے جنگ میں ضرور شریک ہو جائے۔ وہ ترجیح اسی کو دیتی تھی کہ اتحادیوں کا ساتھ دے۔ اس میں کچھ ضرورت کا تقاضا تھا اور کچھ جذبات کا ایک تو وہ بلقان کی شکست کا داغ مٹانا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ جانتی تھی کہ ترکی کا جنگ سے بچنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اگر اتحادیوں کو فتح ہوئی تو روس آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

جن لوگوں کی اس زمانہ میں یہ رائے تھی کہ ترکی جنگ سے علیحدہ رہ سکتا تھا اور اسے یہی کرنا چاہیئے تھا انھیں آیندہ واقعات کو دیکھ کر اپنا خیال بدلنا پڑا۔ بہر حال اس وقت نو صلح کی پارٹی نے انتہائی کوشش کی ترکی جنگ میں شریک نہ ہو۔ مگر ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس کا پہلے سے خیال بھی نہ تھا جرمنی کے دو جنگی جہاز بحر اسود میں موجود تھے۔ انھیں ترکی حکومت نے خرید لیا تھا۔ مگر ان کی کمان اب تک جرمن بحری افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان جہازوں نے روس کے جہازوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ ۴۔ نومبر کو روس نے اور ۵۔ نومبر کو انگلستان اور فرانس نے ترکی سے

اعلان جنگ کر دیا۔

ترکی نے جنگ عظیم میں جو کچھ کر دکھایا اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ظاہر ہے کہ جب جرمنی نے ترکی کے ساتھ خفیہ معاہدہ کیا تھا تو اسے ترکوں کی فوجی قوت سے اتنی امید نہ تھی جتنی عالمگیر اسلامی اتحاد اور عالمگیر تورانی اتحاد کے اثر سے تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب خلیفہ اسلام جرمنی کا طرفدار ہو گا تو اتحادیوں کو اپنی مسلمان رعایا سے کوئی مدد نہ ملے گی مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ عالمگیر تورانی اتحاد کی تحریک جس سے یہ توقع تھی کہ روس میں انتشار پیدا کر دے گی بہت کمزور نکلی۔ اگر جرمنی کو جنگ میں فتح ہوتی تو شاید اس تحریک سے کچھ کام نکلتا مگر موجودہ صورت میں تو اس سے نہ تو جرمنی کو کچھ مدد ملی اور نہ ترکی کو۔ البتہ اس کی تلافی اس طرح سے ہو گئی کہ ترکی کی فوج نے وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

جب ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو اتحادیوں کے اخبارات بہت خوش تھے انھیں یقین تھا کہ تین مہینے کے اندر ترکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اتحادی ریاستیں اس کے حصے بخرے کریں گی۔ اسی وجہ سے ان ریاستوں نے پوری طاقت سے دردانیال پر حملہ کر دیا۔ یہی لڑائی کا سب سے اہم مورچہ تھا دردانیال کا معرکہ دنیا میں یادگار رہے گا۔ ترکی کا دردانیال کو دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھنا اور دوسرے مقامات پر بھی جرمنی کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے میدان سے قدم نہ ہٹانا جنگ عظیم کے اہم ترین واقعات سمجھے جاتے ہیں۔

بلقان کی شکست کی وجہ سے ترکوں کی جنگی قوت کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا تھا وہ اب بالکل دور ہو گیا۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر وہ اتنی پامردی سے روس کا مقابلہ نہ کرتا تو شاید انقلاب روس اس قدر جلد واقع نہ ہوتا۔ انقلاب تو آنے ہی والا تھا۔ دیر سویر ضرور آتا۔ لیکن اگر روس آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیتا تو ممکن تھا کہ یہ بلا کچھ دن اور ٹل جاتی ۱۹۱۸ء میں ترکی کو قطعی شکست ہو گئی اور اکتوبر میں مُدرس کے مقام پر عارضی صلح نامہ پر دستخط کر دئیے گئے۔

تقسیم کے منصوبے: ترکی کی تقسیم کا پہلا منصوبہ معاہدہ قسطنطنیہ کہلاتا ہے۔ یہ معاہدہ مارچ ۱۹۱۵ء میں فرانس، روس اور انگلستان کے درمیان ہوا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ آبنائے باسفورس روس کو دے دیا جائے، قسطنطنیہ کی بندرگاہ میں اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کے داخلے کی عام اجازت ہو، مقامات مقدسہ ترکی سے علیحدہ کر کے ایک مسلم عرب ریاست کے ماتحت کر دئیے جائیں۔ عرب کے قوم پرستوں شریف مکہ اور اتحادیوں میں ترکوں کے شریک جنگ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتا ہو چکا تھا دوسرا منصوبہ معاہدہ لندن کہلاتا ہے۔ جس پر اپریل ۱۹۱۵ء میں دستخط ہوئے تھے اس کی رو سے ترکی جنگ میں شریک کیا گیا اور اسے عدالیہ دینے کا وعدہ کیا گیا تیسرا منصوبہ سائیکس پیکو معاہدہ کہلاتا ہے۔ یہ مئی ۱۹۱۶ء میں روس، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا۔ اس کا تعلق زیادہ تر عرب کے علاقوں سے تھا مگر وہ عربوں سے بالکل پوشیدہ رکھا گیا۔ جب بالشویک حکومت نے اسے شائع

کر دیا تو سلطان حسین نے معاہدہ سیورے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ٹوائنبی اس معاہدے کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس پوشیدہ معاہدے اور اس قسم کی اور چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحادیوں کے نمائندے جنگ میں کامیاب ہونے کی امید پر آرام سے بیٹھے سلطنتوں کے ٹکڑے کرنے اور نئی ریاستوں کے نقشے بنانے کا کھیل کھیلا کرتے تھے جیسے کوئی آرے کے معمے حل کرنے کے لئے کاغذ کے ٹکڑے کاٹ کر ادھر سے ادھر چپکاتا ہے۔ سیاست داں ایسے ہی کھیلوں سے جی بہلاتے ہیں"۔

چوتھا منصوبہ سیں ژان اد موریں کا معاہدہ کہلاتا تھا جو اپریل ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ اس میں اٹلی سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ایشیائے کوچک کا مغربی حصہ اور سمرنا اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ چونکہ اسی زمانے میں روس نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ اس معاہدے پر دستخط نہیں کر سکا۔ اس لئے انگلستان اور فرانس اسے واجب العمل نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اٹلی سمجھتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ترکوں کے سامنے صلح کی جو شرائط پیش کی گئی تھیں وہ انھی مخفی معاہدوں پر مبنی تھیں۔ ادھر یہ مشکل ہوئی کہ جنگ میں شکست ہونے کے بعد نوجوان ترکوں کے ہاتھ سے حکومت نکل گئی اور انھیں جلاوطن ہونا پڑا۔

۱۹۱۸ء میں اتحاد و ترقی کی پارٹی اور ترکی سلطنت دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ہم اختصار کے ساتھ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مشرق ادنیٰ میں مشرق اور مغرب کی کش مکش نے

اُس زمانے میں کیا صورت اختیار کی۔

ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں نے ان اعلیٰ مقاصد کا غور سے مطالعہ کیا تھا جو اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے آغاز میں اہل مغرب کے پیش نظر تھے۔ اور ان مقاصد پر اپنے سیاسی ادارات کی بنا رکھی تھی۔ وہ ان مغربی چیزوں کو مشرق کے بہترین تصورات کے خارجی مظاہر سمجھتے تھے۔ وہ مغرب کے ساتھ برابری کے دعوے دار تھے۔ کمتری کا احساس ان میں مطلق نہ تھا۔ مغرب کی مشینوں اور اس کی صنعتی اور تجارتی ترقی کو وہ کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھتے تھے۔ غرض اس وقت تک مغرب کو قطعی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ محض ایک دانشمند ہمسایہ اور مشیر کار سمجھا جاتا تھا۔

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں کی نظر صرف مغرب کی مادی، تجارتی اور صنعتی زندگی تک محدود رہی۔ ظاہر ہے کہ اس میں مشرق کا مغرب سے کوئی مقابلہ نہیں اس لئے یہ لازمی تھا کہ ایک طرف ترکوں کے دل میں کمتری کا احساس پیدا ہوا اور دوسری طرف وہ مغرب کے مادی تمدن کے بلند معیار تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس معیار کو حاصل کرنے کے لئے ان خارجی ادارات کا قائم کرنا ضروری تھا جن کی وجہ سے مغرب کو یہ قوت حاصل ہوئی تھی ایسے ماحول میں جہاں قدامت پرست اب تک مشرق کی اخلاقی برتری کے دعویدار تھے اور خارجی چیزوں کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتے تھے کسی قسم کی اصلاح کرنے کے لئے حکومت کو بہت زیادہ اختیارات کی

ضرورت تھی۔ اس لئے نوجوان ترکوں کو دستوری حکومت سے استبدادی طریقوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس رجعت کو اچھی طرح سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے جو نمونہ قائم کیا تھا اس کی تقلید بہت سے ملکوں نے کی اور جنگ کے بعد جابجا ایسی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں ایک پارٹی مختار کل کی حیثیت رکھتی تھی۔

۱۹۱۸ء میں جب ترکی میں ۱۸۷۶ء کا دستور اساسی دوبارہ جاری کیا گیا تو اس میں بہت کم ترمیم ہوئی۔ وہ فرانسیسی دستور کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔

سلطان کے اختیارات بہت محدود کردیئے گئے۔ اس کا کام اب زیادہ تر یہ رہ گیا کہ رسموں اور تقریبوں کو اپنی شرکت سے زینت بخشے۔ خلیفہ کی حیثیت سے وہ برائے نام اسلامی ادارات کا سردار تھا مگر اسے مذہبی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا۔

پارلیمنٹ میں جو سب سے بڑی پارٹی کا لیڈر ہوتا تھا وہی اپنی وزارت قائم کرتا تھا۔ ایک سینیٹ یا مجلس مشورہ قائم کی گئی جس کے چالیس ارکین تھے اور وہ سلطان کی طرف سے تاحیات نامزد کئے جاتے تھے۔

یہ تھا حکومت کا ظاہری ڈھانچہ۔

انجمن اتحاد و ترقی کی ایک عام مجلس تھی جسے ہر سال پارٹی کی کانگریس منتخب کرتی تھی۔ اس کے کلب صوبوں کے صدر مقامات پر کھولے گئے۔ مجموعی طور پر ابتدا میں اس کی ہیئت وہی تھی جو اور سیاسی پارٹیوں کی ہوتی ہے۔

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے جس طرح مخالف پارٹی کا مقابلہ کیا اس کا مطالعہ مشرق کے ان تمام ملکوں کو جنھوں نے خود اختیاری حکومت نئی نئی حاصل کی ہے، بہت غور سے کرنا چاہیئے۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد ارباب اتحاد و ترقی کے طرز عمل سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوگئی کہ انھوں نے اس طرح کی دستوری حکومت کا خیال، جو عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں کے پیش نظر تھی، ترک کر دیا تھا۔

پارٹی کی مجلس عامہ جس نے جنگ کی مخالفت کی تھی توڑ دی گئی۔ ایک مرکزی کونسل قائم کی گئی۔ لیکن اس کا انتخاب سالانہ کانگریس میں باقاعدہ نہیں ہوتا تھا۔ آگے چل کر اس نے ایک مخفی کابینہ کی شکل اختیار کر لی پارٹی کے وکیل ہر صوبے میں بھیجے جاتے تھے۔ حکومت اصل میں یہی کرتے تھے گورنر محض برائے نام تھے۔ وہ عمال جو پارٹی کے ارکان نہیں تھے اپنے عمل میں آزاد نہ تھے ساری طاقت پارٹی کی چھوٹی سی جماعت کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ریاست کے نظام میں قوت حیات باقی نہیں رہی اور اس کا رعب لوگوں کے دل سے اٹھ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ پارٹی کی استبدادی حکومت جس کی بنا اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے رکھی تھی ایک نہایت قوی نظام تھا جس میں سارے اختیارات ایک مرکز میں مجتمع تھے۔ مگر یہ چیز وہ نہیں تھی جس سے ایک جمہوری اور دستوری حکومت نشوونما پاتی اس میں کسی دوسری پارٹی کا وجود نہیں تھا۔ یعنی کوئی ایسی تربیت یافتہ

جماعت نہ تھی کہ اگر یہ پارٹی ناکام رہے تو حکومت اس کے سپرد کی جاسکے۔ ایک تو یہ بڑی خرابی تھی دوسری یہ تھی کہ عمال کے طبقے کی اخلاقی قوت مائوف ہوچکی تھی۔

اگرچہ اتحاد ترقی کے نوجوان ترک فلسفیانہ تخیل اور ذہنی تہذیب کے لحاظ سے عہد تنظیمات کے مدبروں سے کمتر تھے مگر دنیا میں پارٹی کی استبدادی حکومت کا نمونہ قائم کرنے میں انھوں نے بڑی جدت اور قابلیت کا ثبوت دیا۔ اس بارے میں وہ عثمانیوں کے حکمراں طبقے سے زیادہ مشابہ تھے۔ مگر اور چیزوں میں وہ ابتدائی عثمانی سلاطین کا مقابلہ نہیں کرسکے عثمانیوں نے اپنے حیرت انگیز نظام سلطنت میں جس طرح عمال کے طبقے کی قوت حیات کو قائم رکھا وہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔

عثمانیوں کی مطلق العنان حکومت کا انتظامی شعبہ زیادہ مستحکم اور پائدار اس وجہ سے تھا کہ ریاست کسی طبقے یا فرقے کی پابند نہ تھی۔ اگر حکومت ایک پارٹی کے ہاتھ میں ہو تو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنی پارٹی کے مفاد کو کل ریاست کا مفاد نہ سمجھنے لگے وہ ملک کے بڑے حصے کو حکومت سے بے دخل کر دیتی ہے اور ساری مادی اور ذہنی دولت پر قبضہ کر بیٹھتی ہے۔ دولت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو پارٹی میں شامل ہو۔ حب وطن اسی کا حصہ سمجھا جاتا ہے جو پارٹی کا رکن ہو۔

اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے سیاسی امور میں مغرب کا اثر قبول کیا وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب مغرب میں انفرادیت کے پہلو بہ پہلو ریاست کا ایک دوسرا نصب العین بھی ابھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ان کے فلسفہ ریاست کا خلاصہ

توفیق الیب ضیا نے جو اتحاد و ترقی کی جماعت میں عجیب و غریب قابلیت اور نہایت ہمہ گیر طبعیت کا شخص گزرا ہے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

فرد کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے جماعت ہے

حقوق کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے فرض ہے۔

اس شعر کا مضمون فرانس کے ماہر عمرانیات ڈرکایم کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ اس نے عہد تنظیمات کے سیاسی فلسفہ کو بلقلم منسوخ کر دیا مگر آگے چل کر یہ ہر مرحلہ کل کی استبدادی حکومت میں اس کا کلمہ پڑھا جانے لگا۔ غرض اتحاد و ترقی کی حکومت نے نہ صرف مغرب کے رنگ کو پوری طرح اختیار کر لیا بلکہ اس نے خود ایک ابتدائی نمونہ اس چیز کا قائم کر دیا جو جنگ کے بعد تمام یورپ میں رواج پا گئی۔

چوتھا خطبہ

ترکی اور جنگ آزادی

خواتین اور حضرات!

اگرچہ میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جائے مگر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۹۱۸ء میں جب دو کروڑ آدمی قتل ہو چکے تھے، ملک کے ملک اُجڑ چکے تھے، بے شمار مخلوقِ خدا تمام بربادی کی مصیبت میں گرفتار تھی، غرض دنیا زیر و بالا ہو گئی تھی، تمام انسانوں کے دل امن و امان کی آرزو سے معمور تھے۔ فاتح اور مفتوح دونوں خلوص اور جوش سے اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ دنیا میں صلح و آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا، جب دنیا کی سب قومیں عدل و انصاف اور ہمدردی کا ایک نیا دور شروع کرنے پر اس قدر مائل ہوں جتنی اس زمانے میں تھیں۔

جنگ سے ترکوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا شاید ہی کسی قوم کو پہنچا ہو۔ وہ پورے دس سال سے میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور ادھر خود اُن کے

گھر میں خوں ریزی اور انقلاب کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا وہ صلح کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ یہ قیمت ماضی قبل صلح سے قبل مغربی مدبروں کے اعلانات سے معین کی جا چکی تھی۔ لائڈ جارج نے ۵۔ جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلان کیا تھا کہ وہ علاقہ جہاں ترک خود آباد ہیں اور دارالسلطنت قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا اس کے معنی یہ تھے کہ اُسے دو تہائی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ترک اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ انھیں اپنے گھر میں چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا اور غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل اور نشو و نما کا موقع ملے گا۔

پریسیڈنٹ ولسن نے کہا تھا "جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم مدعی ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے" ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا تھا "ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں۔ انصاف ایسا ہونا چاہیے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے" پرانے مدبروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نوع انسانی امن کی آرزومند ہے ان الفاظ میں جو شیکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کی طرح پریسیڈنٹ ولسن کے

چودہ اصول بھی یاد گار رہیں گے مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا۔ وہ دنیا کی بزم شورہ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آنکلا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ صلح کی شرطیں انھیں پرانے طرز کے مدبروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حب وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے ان کے لحاظ سے محب وطن بھی تھے۔ مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آ رہی تھیں، نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے۔ اتنے نا فہم تھے کہ انھوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محب وطن، اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اُسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی امن و امان کی فضا پیدا کرنی چاہیئے۔

عارضی صلح کے بعد اتحادیوں کی فوجوں نے استنبول، سلیشیا اور چنک پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں کی فوجیں منتشر ہونے لگیں۔ چھ مہینے تک ترک اس دھوکے میں رہے کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامے پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا۔

مگر حریفوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی کے پاس فوج نہیں رہی ہے تمام ملک میں ابتری اور بے بسی کی حالت ہے تو ان کے منھ میں پانی بھر آیا اور وہ خواہشیں جن کی بنا پر مخفی معاہدے کئے گئے تھے پھر ابھر آئیں۔ آرنلڈ تو ابنی اپنی کتاب "ترکی" میں لکھتا ہے "جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں

اُسی طرح مغرب کی ریاستیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں کیونکہ ترکی ایک زرخیز ملک ہے اور یورپ کی شہنشاہیت بہت لالچی ہے۔

اندرونی حالت | اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی انجمنوں کی رہبری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے لیتی اور قوم کی نمایندگی کرتی۔ اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے کوئی اور پارٹی قائم ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ایک پارٹی کی حکومت میں یہ بھی ایک بڑا عیب ہوتا ہے ممکن ہے کہ وہ جنگ اور انقلاب کے زمانے میں بہت کامیاب ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اصلاحات کو بہت جلد عمل میں لا سکے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا پھر ملک کی سیاسی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ پارٹی اپنے آپ کو کل قوم کا نمائندہ سمجھتی ہے اور اس کے دشمن بھی یہی سمجھتے ہیں اس لئے اگر انھیں اس پارٹی سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ کل قوم سے اس کا بدلا لیتے ہیں۔ ایک طرف اتحادی ریاستیں اور دوسری طرف اتحاد و ترقی کے اندرونی دشمن نوجوان ترکوں کی زیادتیوں کی سزا بے قصور ترکی قوم کو دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ در اصل قصوروار تھے وہ تو چلے گئے تھے۔ اب صرف وہ لوگ باقی تھے جنھوں نے صرف بعض چیزوں میں جماعت اتحاد و ترقی کا ساتھ دیا تھا اور جن کا وجود ترکی کے لئے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو کبھی نہ کبھی اس جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔

حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔

چونکہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کے برخاست کئے جانے سے کوئی حرج نہیں ہوا مگر سلطان نے نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا اور ملک کی حکومت خود اس کے اور ان ریاستوں کے ہاتھ میں رہی جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں وہ اپنی مجلس وزراء میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بھی رکھتا تھا جن کی قابلیت اور حب وطن میں شبہ کی گنجائش نہ تھی مگر جہاں انھوں نے بیرونی حکومتوں کے احکام پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے سے انکار کیا وہ فوراً موقوف کر دیئے جاتے تھے۔

<u>ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز</u> ترکوں کے سامنے صلح شرائط پیش کرنے سے پہلے اتحادی ترکوں کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مشرق ادنیٰ میں ایک یونانی سلطنت قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تھریس، سمرنا اور اس کے عقب کا علاقہ شامل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ترکیب سے آبنائے اتحادیوں کے لئے کھلا رہے گا اور ترک، بلغاری اور روسی اس کے قریب نہ آنے پائیں گے انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مشرق میں ٹمسون سے لے کر بحیرۂ اخضر تک اور بحر روم سے سلشیا تک جو بحر اسود کے کنارے واقع ہے۔ آرمینیہ کی خود مختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اس نئی ریاست کے لیے وہ نہ صرف ترکی کا علاقہ بلکہ ایران اور روس کا کچھ حصہ بھی چھیننا چاہتے تھے اس دوسری تجویز کو عمل میں لانے کی انھیں کوئی جلدی نہیں تھی ترکی آرمینیہ کی مستقل حیثیت کو پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ نئی تجویز سے اور مشرقی

سلطنتوں کے بھڑک جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ کاظم قرابکر پندرہ ہزار باقاعدہ ترکی فوج لئے ہوئے موجود تھا اور سرحد پر جو مسلمان قبائل رہتے تھے وہ بھی بڑے جنگ جو لوگ تھے۔ اتحادی جہازوں کی توپوں کی زد سے یہ علاقہ باہر تھا۔ البتہ پہلی تجویز یعنی سمرنا کو یونانیوں کے حوالے کر دینا، قابل عمل تھی اور اس کے لئے یہ موقع بھی بہت اچھا تھا اس لئے کہ اٹلی جو خود سمرنا کا دعویدار تھا صلح کی کانفرنس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ آرنلڈ تو ابھی اتحادیوں کی اس قسم کی حرکتوں کو ایک دوسرے کی جیبیں کترنے سے تعبیر کرتا ہے اتحادیوں نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ نوٹس دیا کہ ہماری فوجیں جہاز سے اتر کر سمرنا میں داخل ہوں گی۔ اس بہانے سے یونانی فوج ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو سمرنا پہونچا دی گئی۔ اس واقعہ نے دم بھر میں کا یا پلٹ کر دی، ترکوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کرنا روک دیا اور فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آرنلڈ ابھی جو مورخانہ بے تعصبی اور انصاف پسندی کی وجہ سے نوع انسانی کے لئے فخر کا باعث ہے۔ یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے "۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعتہً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی

ندیاں بہ گئیں ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرون ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کرائے گئے یا جلا وطن کر دئے گئے۔ غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔

ترکی کی طرف سے جو رد عمل ہوا اس کے متعلق یہ بات دنیا کو نہیں بھولنی چاہیئے کہ اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا جن میں کسان پہاڑی لوگ بلکہ عورتیں تک شامل تھیں۔ استنبول سے فوجی افسر بے اجازت بھاگ کر تھریس پہونچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا بسارے ملک میں احتجاج کے جلسے کئے گئے۔ دو چیزوں نے اس قوت جذبات کو کامیابی کی منزل پہ پہونچایا ایک تو یہ کہ اوسط طبقے کے ترکوں میں سے ہزارہا آدمی ایسے نکل آئے جنھوں نے نہ صرف اپنی جانوں کو قربان کیا بلکہ تنظیم میں بھی کمال کر دیا دوسرے یہ کہ معدودے چند لیڈر جو انہیں ہاتھ آئے اس مادی اور اخلاقی قوت سے کام لینے کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ میں نے یہ حیرت انگیز تاریخی ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیا ہے۔ مجھے بڑے سرداروں کی قابلیت اور ان کی خدمات کا دل سے اعتراف ہے مگر میرے نزدیک لڑائی کی جان اور کامیابی کا راز جمہور کا عزم تھا جنھوں نے زندگی سے مایوس ہو کر وہیں

سمجھ لیا تھا کہ بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جانے سے یہی بہتر ہے کہ میدان جنگ میں لڑکر مارے جائیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر میں جنگ کے واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کروں گا۔

اندرونی قوتیں اور ان کا اتحاد جب لڑائی شروع ہوئی تو اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج ترکی میں موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس مشرق میں کاظم قارا بکر کی پندرہ ہزار باقاعدہ فوج وسط اناطولیہ میں علی فواد پاشا کی چھوٹی سی جمعیت اور چند ادر نیم مسلح دستے تھے جو ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے باقی جو کچھ تھے وہ رضا کاروں کے بے قاعدہ جتھے جن کے پاس سامان جنگ محض برائے نام تھا۔

اتحادیوں کو مشرق کی طرف سے زیادہ اندیشہ تھا اس لئے انھوں نے سلطان سے کہہ کر مصطفےٰ کمال پاشا کو وہاں ناظر حربی کی حیثیت سے بھیجدیا تاکہ ترکی فوجوں کو منتشر کردے۔ مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے پہلے استنبول ہی فوج کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقات اور گفت و شنید کرلی تھی۔

اماسیا کا اقرار نامہ ۱۹ جولائی ۱۹۱۹ء کو مصطفےٰ کمال پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا اور رؤف بے نے اماسیا کے مقام پر جمع ہوکر ایک اقرار نامے پر دستخط کئے جسے موجودہ ترکی ریاست کی بنیاد سمجھنا چاہیئے اس کا خلاصہ یہ ہے ملک کی مرکزی حکومت بیرونی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے ترکی جمہور نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ اسے غیر ملکیوں کے ماتحت رہنا ہرگز منظور نہیں اور وہ ان سے لڑنے کو طیار ہے

قوم کی قوت اور جد و جہد کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک کانگرس جو تمام قوم کی نمائندہ ہو منعقد کی جائے اور وہ یہ فیصلہ کرے کہ ملک کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

ارض روم کانگریس ۲۳۔ جولائی ۱۹۱۹ء کو پہلی کانگریس مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نمائندہ جماعت منتخب کی جائے جو ضرورت کے وقت اناطولیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ملک کی حفاظت کا سامان کرے۔ اسی کانگریس کی ہدایت کے مطابق تمام ترکی فوجیں جو یونانی حملے کی مدافعت کر رہی تھیں اناطولیہ کے مرکز کے ماتحت ہو گئیں اور ایک قومی عہد نامہ تیار کیا جانے لگا جو ساری قوم کے لئے قابل قبول ہو۔

سیواس کانگریس ۴۔ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگریس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اناطولیہ سلطان کی حکومت سے علیٰحدہ ہو گیا اور اس نے ملکی اور فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطان نے خوف زدہ ہو کر داماد فرید پاشا کی وزارت کو جو اتحادیوں کا آلہ کار سمجھی جاتی تھی معزول کر دیا۔ اور ایک نئی کابینہ مقرر کی جس کے اکثر ارکان قوم پرور پارٹی کے تھے یا اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا بھی حکم دے دیا۔ قوم پرور پارٹی کو بہت بڑی تعداد میں منتخب کیا جنوری ۱۹۲۰ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ اس کا لیڈر بالفعل رؤف بے تھا۔ خوش قسمتی سے مصطفےٰ کمال، اور دوسرے فوجی سردار

اناطولیہ ہی میں رہے۔

پارلیمنٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ قومی معاہدے کو مکمل کرکے شائع کردیا اس کا مضمون قریب قریب وہی رہا جو پہلی بار ارض روم کی کانگریس میں تجویز ہوا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جن پر عارضی صلح کے وقت اتحادیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا وہ ترکی کی حکومت میں رہیں۔ بقیہ علاقے جن پر اس وقت قبضہ کیا گیا تھا اور جن میں زیادہ تر عربوں کی آبادی تھی، اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں اور اس میں اُن کے باشندوں کو آزادی سے رائے دینے کا حق دیا جائے ترکی کی طرف سے جو وعدہ کیا گیا باسفورس اور دردانیال میں سب قوموں کے تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اس بات کا ذمہ لیں کہ اسنتبول اور مجیدہ مارمورہ بیرونی دست اندازی سے محفوظ رہے گا۔ ترکی میں اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمسایہ ملکوں میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہیں۔

ابھی اتحادیوں نے صلح کے شرائط کا جو وہ ترکی کے سامنے پیش کرنے والے تھے عام اعلان نہیں کیا تھا کہ انھیں قومی معاہدے کی اطلاع بھیج دی گئی اب ان کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ ترکوں کی یہ شرائط جو خود انھوں نے عارضی صلح سے پہلے ترکوں کے سامنے پیش کی تھیں منظور کرلیں اور جنگ کو ختم کردیں یا سینہ زوری سے کام لے کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز پر اڑے رہیں۔ انھوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

۱۶ مارچ کو اتحادیوں نے وہ معرکے کا حملہ کیا جو دنیا میں مشہور ہو گیا انھوں نے استنبول میں اور فوجیں اتاریں جو تمام قوم پروروں کے گھروں پر چھاپہ مار کر انھیں ان کے بستروں سے کھینچ لائیں۔ اس کے بعد وہ پارلیمنٹ پر ٹوٹ پڑیں۔ اور بہت سے قوم پرور ممبر جن میں رؤف بے بھی شامل تھا، گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے جہاں ہزاروں آدمی جو اتحاد و ترقی کے رکن تھے یا سمجھے گئے تھے پہلے سے نظربند تھے۔ اتحادیوں نے مارشل لا جاری کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص کسی قوم پرور کو اپنے گھر میں پناہ دے گا اُسے قتل کی سزا دی جائے گی عیسائیوں کے جتھے مسلح کر کے ان سڑکوں پر جو اناطولیہ کو جاتی تھیں متعین کر دیئے گئے کہ قوم پرور بھاگ کر اس طرف نہ جانے پائیں ترکوں نے بھی فوراً اپنے جتھے بنا لئے اور قوم پروروں کو بھاگنے میں مدد دینے لگے۔ اتحادیوں کی فوجوں کے قدغن کے باوجود بہت سے لوگ سامان جنگ کے ساتھ بچ کے نکل گئے۔

سلطان کی حکومت نے ایک عدالت خاص قائم کی جس کی طرف سے ان قوم پروروں کی، جو سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے تھے، پہلی فہرست شائع کی گئی اس میں مصطفےٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور ایک عورت کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان ان لوگوں میں سے کسی شخص کو قتل کرے گا وہ سیدھا مسلمانوں کی جنت میں جائے گا نہایت افسوس کی بات ہے کہ شیخ الاسلام نے پہلی بار نہ صرف غیر ملکی حکومتوں کا ساتھ دیا بلکہ ظلم و استبداد پر

کمر باندھ لی۔

اس اثنا میں مصطفٰے کمال پاشا نے، جو کچھ دن پہلے انگورہ پہونچ چکے تھے، یہ اعلان کیا کہ قومی پارلیمنٹ کا اجلاس انگورہ میں ہوگا۔ جمہور کو چاہئے کہ پرانے ممبروں میں سے جو لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکتے یا نہیں ہونا چاہتے ان کی جگہ دوسرے ممبروں کو منتخب کر کے بھیجیں۔ یہی وہ جماعت تاسیسی تھی جس نے نئی ریاست قائم کی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت جماعت تاسیسی کا اجلاس ۲۳ ر اپریل ۱۹۲۰ء کو انگورا میں ہوا۔ اس نے ملک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا نام "قومی مجلس عالیہ کی حکومت" رکھا۔ مشرق میں یہ پہلی جمہوری حکومت تھی جو خود جمہور نے قائم کی۔ مشرق اور مغرب کی کش مکش میں یہی سب سے اچھی مغربی چیز تھی جو مشرق نے اختیار کی۔ تاریخ میں پہلی بار نہایت نازک موقع پر ملک کی حکومت کا پورا بار اہل انا طولیہ کے کاندھوں پر رکھا گیا۔ جمہور کے نمائندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان لوگوں کا کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان مٹھی بھر عثمانی ترکوں کا جنھوں نے تیرھویں صدی میں عثمانی سلطنت کی ایسی مضبوط بنیاد رکھی کہ وہ سات سو سال تک ہلائے نہ ہلی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور انقلاب فرانس کی حکومت میں بہت مشابہت ہے۔ وہ مقننہ اور عاملہ دونوں کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتی تھی۔ مجلس کا پریسیڈنٹ حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وائس پریسیڈنٹ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی مجلس وزرا، کا کام کرتی تھی۔ ہر وزیر کا انتخاب

مجلس علیحدہ علیحدہ کرتی تھی اور وہ انفرادی حیثیت سے مجلس کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس مجلس کا دستور اساسی اس قابل ہے کہ اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے اس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی طرز حکومت کی مثال، جو حقیقی جمہوریت سے اتنی قریب ہو، مشکل سے ملے گی۔

اس اپریل سے جون تک حکومت کے لئے سب سے مشکل زمانہ تھا اُسے سارے ملک میں عدالتی اور انتظامی محکمے قائم کرنے تھے اس کام میں کسی قدر آسانی اس وجہ سے ہوگئی کہ نوجوان ترکوں نے جو نظم قائم کیا تھا وہ اب تک چل رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی ترتیب میں زیادہ وقت پیش آئی کیونکہ ایسے لوگ جو اس میں حصہ لے سکتے ہوں یا لینا چاہتے ہوں بہت کم تھے۔ مگر سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ وسط اناطولیہ کی حفاظت کا دار و مدار بے قاعدہ فوج پر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فوج میں بعض لوگ بڑے بلند خیالات کے تھے اور وہی اس قومی تحریک کے ہراول تھے مگر عام سپاہیوں میں نظم وضبط قائم رکھنا بہت مشکل تھا اور وہ بعض اوقات اتنی ہی زیادتیاں کر بیٹھتے تھے جتنی یونانیوں کی فوجیں کرتی تھیں اس کے علاوہ سلطان نے اتحادیوں کے روپے سے غیر ترکی فوجیں بھرتی کی تھیں اور انھیں افواج خلافت کے نام سے اناطولیہ میں قوم پروروں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

معاہدہ سیورے اور بے قاعدہ فوج کا خاتمہ | اس زمانے میں دو باتیں ایسی ہوئیں

جن سے قومی مجلس عالیہ کی حکومت کی بن آئی۔ ان میں سے پہلی چیز سیورے کا معاہدہ تھا جس پر دستخط کرکے سلطان کی حکومت نے ترکی قوم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس معاہدے کی شرطیں ترکی کے متعلق یہ تھیں کہ سمرنا اور اس کا عقبی علاقہ اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو دے دیا جائے، مشرق سے لے کر جنوب میں سلیشیا تک جس میں کردوں کا علاقہ شامل تھا آرمینیہ کی ریاست قائم کردی جائے، بندرگاہیں اتحادیوں کے سپرد کردی جائیں، دردانیال، استنبول اور بحیرہ مارمورہ کے مشرقی اور مغربی ساحل اتحادیوں کے انتظام میں رہیں، ترکی کی مالیات بھی اُن کی نگرانی میں دے دی جائے۔ قدیم تجارتی اور عدالتی حقوق صرف فاتح قوموں کے لئے بحال کردئے جائیں، ترکی کو ہوائی یا جنگی جہاز رکھنے کی اجازت نہ ہو۔ بلکہ صرف پندرہ ہزار بری فوج جس میں فوجی پولیس شامل ہے باقی رہنے دی جائے، اناطولیہ کا بے آب وگیاہ علاقہ جو ترکوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ بھی مغربی ریاستوں کے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کردیا جائے۔

سلطان کا معاہدۂ سیورے پر دستخط کرنا اور پھر غیر ملکی فوجوں کے ساتھ افواج خلافت کو ترکی قوم کا خون بہانے کے لئے بھیجنا ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ سلطنت اور خلافت دونوں کے نام سے بیزار ہوگئے۔

ادھر نئی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج ترتیب دی اور بے قاعدہ جیشوں کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ بعض جمعیتوں نے سرکشی اختیار کی اور وہ بھی ملن

اُس وقت جب یونانیوں کی طرف سے شدت کا حملہ ہو رہا تھا مگر نئی حکومت کی چھوٹی سی فوج نے اِنُو نو کے مقام پر ایک طرف یونانی فوج کو اور دوسری طرف ترکوں کی باغی فوج کو شکست دی۔ اس فتح سے ترکی قوم کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اُسے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوگیا۔ اب لوگ دل وجان سے نئی حکومت کا ساتھ دینے لگے

اس زمانے میں لندن میں جو کانفرنسیں اناطولیہ کے مسئلے کے متعلق ہوئیں اُن کا ذکر میں چھوڑتی ہوں۔ یہ اُسی وقت کی جاتی تھیں جب ترکوں کی فتح ہوتی تھی ان کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانی فوج کو سنبھلنے کی مہلت مل جائے۔

معرکہ سقاریہ | ترکوں اور یونانیوں کی فیصلہ کن لڑائی سقاریہ کے مقام پر ہوئی یونانیوں نے اسکی شہر میں ترکوں کو شکست دینے کے بعد تمام ریلوں پر قبضہ کرلیا تھا اور انگورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ترکوں کے لئے بڑا نازک وقت تھا مگر ان کی قوم اور قومی مجلس اس امتحان میں پوری اُتری۔

مصطفےٰ کمال پاشا سپہ سالارِ اعظم بنائے گئے اور انھیں غیر معمولی اختیارات دے دئے گئے۔ عصمت پاشا محاذ جنگ کے سپہ سالار، فیضی پاشا ان کے نائب اور رفعت پاشا وزیر جنگ ہوئے۔

ترکوں کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ اُنھیں مشرق سے سپاہی اور سامانِ جنگ محاذ پر پہنچانا تھا۔ موسم انتہا سے زیادہ خراب تھا۔ راہ میں صحرا اور پہاڑ حائل تھے۔ باربرداری کا ذریعہ اونٹوں، بیل گاڑیوں اور انسانوں کے

کندھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو چار سو میل سے زیادہ کی سنگلاخ اور دشوار گذار راہ پیدل طے کرنی پڑی۔ اسلحہ سازی کے عارضی کارخانے قائم ہو گئے اور ریلوں کی بچی کھچی پٹریاں اکھاڑ کر ہتھیار ڈھلنے لگے۔

یونانیوں کے پاس اسی ہزار تربیت یافتہ فوج، اعلیٰ درجے کا توپ خانہ جس میں دو سو توپیں تھیں، سامان جنگ با فراط، ریلیں، لاریاں اور مغربی ترکی کی بہترین سڑکیں، ترکوں کی کائنات پچیس ہزار فوج جس کے پاس کچھ نئی، کچھ پرانی، کچھ مارزہ کچھ مارٹی بندوقیں، کل چھ توپیں، بہت تھوڑا سامان جنگ اور باقی خدا کا نام۔

ترکوں نے جو شجاعت میدان جنگ میں دکھائی، زبان میں طاقت نہیں کہ اسے بیان کر سکے تیئیس دن کی لڑائی میں ساڑھے سولہ ہزار ترک کام آئے جن میں افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ترک حملہ کرتے تھے انی گنی چھ توپوں کے سہارے پر۔ یونانیوں کا پشت پناہ زبردست توپ خانہ تھا مگر کیا مجال کہ ایک سپاہی بھی میدان جنگ سے منہ موڑے۔ کاظم قرابکر پاشا نے میدان جنگ سے جو تار مصطفےٰ کمال پاشا کو بھیجا تھا اس سے ترکی فوج کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ "جب تک پہاڑی کی کسی چوٹی پر ایک ترک سپاہی بھی باقی رہے گا، مقابلہ جاری رہے گا"۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے ان دنوں ایک تقریر کی تھی جس کے چند دلاویز فقرے میں آپ کو سناتی ہوں۔

"قومی مجلس کے صدر کی حیثیت سے میں آپ حضرات کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا مقصود جنگ نہیں ہے۔ ہم صلح کے طالب ہیں۔ میرے خیال میں کوئی چیز ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر یونانی فوج یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق چھوڑ دیں گے تو یہ محض اس کی خام خیالی ہے۔ دشمن ہمارا نام صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں، ہم نے اپنی حفاظت کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ اس سے بڑھ کر جائز اور معقول بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم یونانی فوج کو ڈھکیلتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ اس کا ایک سپاہی بھی ہماری زمین پر باقی نہ رہے۔"

ترکوں کو سقاریہ میں فتح حاصل ہوئی۔ کلیئر پرائس نے اپنی کتاب "ترکی کی دوبارہ زندگی" میں اس فتح کی پوری اہمیت ذیل کے الفاظ میں دکھائی ہے:-

"ترکوں کو دریائے سقاریہ کے کنارے جو فتح حاصل ہوئی اس نے مشرق ادنیٰ اور مشرقِ وسطیٰ کا سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ دو سو سال سے مغرب قدیم عثمانی سلطنت کو پارہ پارہ کر رہا تھا مگر سقاریہ کے کنارے اس کا سامنا خود ترکی قوم سے ہوا۔ اس چٹان سے ٹکرانا تھا کہ دھارے کا رُخ پلٹ گیا۔ مورخوں پر ایک دن یہ حقیقت کھل جائے گی کہ سقاریہ کی یہ چھوٹی سی لڑائی ہمارے زمانے کا سب سے زبردست فیصلہ کن معرکہ تھا۔"

اس فتح کی بدولت نئی حکومت کے قدم جم گئے۔ یونانی فوج کی کمر ٹوٹ گئی

اور اتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرانس نے صلح کر لی، قومی مجلس عالیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور سلیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ اٹلی نے عدالیہ کو خالی کر دیا۔ سوویٹ روس نے ۱۹۲۰ء میں انگورہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت بڑی مادی اور اخلاقی مدد ملی کہ لڑائی کے زمانے میں جب ہمیں اپنی ساری قوت مغربی سرحد پر مجتمع کرنی تھی، ہم مشرقی سرحد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ایک بڑی وجہ کامیابی کی یہ بھی تھی کہ کاظم قارابکر نے آرمینیہ کی لڑائی میں اردھان اور قرص لے کر صلح کر لی تھی۔ اس لئے سقاریہ کی جنگ میں ترکی کو مشرق سے فوجیں اور سامان جنگ برابر پہنچتا رہا۔

اس نازک زمانے میں ہندوستان نے بھی ترکوں سے بڑی ہمدردی کی اور انھیں بہت مدد دی۔ میں اس معرکے کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے آپ لوگوں کے سامنے سر نیاز خم کرتی ہوں اور دلی مسرت کے ساتھ یہ الفاظ کہتی ہوں "بھائیو اور بہنو! میرا شکریہ قبول کیجئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے"۔

آخری فتح | جنگ سقاریہ کے سال بھر بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوج نے مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں جارحانہ اقدام شروع کیا اور سمرنا کو فتح کرنے سے پہلے اپنا سارا ملک یونانی فوجوں سے خالی کرا لیا۔ مغربی ریاستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوزان میں صلح کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ دنیا نے مان لیا کہ ترکی قوم لڑائی کی آگ میں تپ کر، تلوار کی باڑھ پر چل کر اپنے امتحان میں پوری اتری۔

لوزان کانفرنس | مغربی ریاستوں نے استنبول کی حکومت اور قومی مجلس عالیہ کی حکومت دونوں کو کانفرنس میں مدعو کیا۔ لوزان جانے سے پہلے اس دو عملی کی گتھی کو سلجھانا ضروری تھا۔ مجلس عالیہ نے ایک طویل اور معرکۃ الآرا اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے منصب الگ الگ کر دئے جائیں۔ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطان منصب حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ استنبول نئی حکومت کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ نومبر ۱۹۲۲ء سلطان وحید الدین نے اتحادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی اور مجلس نے عبد المجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء میں شروع اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گئی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور اتحادیوں کے درمیان جو صلح نامہ ہوا اس میں ترکوں کے قومی معاہدے کی تمام دفعات تسلیم کر لی گئیں۔

خواتین اور حضرات!

آپ سب لوگ اور ساری دنیا بجا طور پر ان مشاہیر کی قدر کرتی ہے جنھوں نے ترکوں کو اس جنگ میں کامیابی کی منزل پر پہنچایا مگر آپ کو کیا معلوم، دنیا کیا جانے کہ ان ہزاروں گمنام عورتوں اور مردوں نے جو اس لڑائی میں کام آئے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ میری التجا ہے کہ جب آپ مسجدوں اور مندروں میں جا کر دعا مانگیں تو ان لوگوں کو نہ بھولیں۔ شہیدوں کی یہ جماعت۔ مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بچے، جنھوں نے اس کوشش میں جان دی کہ ان کی قوم امن اور عزت کے ساتھ دنیا میں رہ سکے، اس قابل ہیں کہ دنیا کی

ساری قومیں قیامت تک ان کے لئے دعا کرتی رہیں۔

ترکی جمہوریہ | ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو قومی مجلس عالیہ نے جمہوری حکومت کی شکل اختیار کر لی اور کابینہ کا نظام قائم کیا۔

نئی ترکی، باست کے اب تک تین دور گذرے ہیں۔ پہلا دور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک رہا۔ یہ قومی مجلس عالیہ کی حکومت کا زمانہ تھا۔ گو اس میں باقاعدہ پارٹیاں نہ تھیں مگر تین فریق موجود تھے جو الگ الگ رائے رکھتے تھے۔ انتہا پسند، معتدل قدامت پسند اور پورے قدامت پسند جن کی تعداد بہت کم تھی۔ آخر الذکر جماعت علماء کی جماعت کہلاتی تھی۔ جو معاملات ساری قوم کے لئے اہمیت رکھتے تھے ان میں سب ایک ہو جاتے تھے، اور معاملات میں الگ الگ رہتے تھے۔ یہ مجلس دنیا کی بہتر سے بہتر پارلیمنٹ کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اگر آپ اس کی کارروائی کی روئداد لفظ بہ لفظ پڑھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ لوگ جن میں سے اکثر معمولی طبقے کے تھے کتنے بڑے دانشمند، مصلحت شناس اور محب حق تھے کہ ان اختلافات کے باوجود اس نازک وقت میں باہمی رواداری اور اتحاد کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ سلطنت کو توڑنے کی تجویز انھوں نے بہ اتفاق رائے منظور کی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر طبقے اور خیال کے لوگ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ترکی کا آئندہ طرز حکومت سلطنت نہیں بلکہ قومی ریاست ہونا چاہیئے۔

دوسرا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک سمجھنا چاہئے۔ ۱۹۲۳ء میں نئے انتخابات ہوئے

پورے قدامت پسندوں کا یعنی علما کا گروہ منتخب نہیں ہو سکا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مجلس نے جمہوری حکومت اور نظام کابینہ کا اعلان کر دیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں اس نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ تجویز بھی کثرت رائے سے پاس ہوئی اور اس کے موید دل میں ہر خیال کے لوگ شامل تھے ملک میں اس پر کسی قسم کا احتجاج نہیں ہوا۔ ترکوں کے نظام حکومت میں اب خلافت کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ میرے جیسے لوگ جو فقہ سے بے بہرہ ہیں اس طرح سرسری طور پر اس پر بحث نہیں کر سکتے۔ میں آپ کے سامنے چند پیش پا افتادہ باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گی۔

ایک ایسی قوت کی حیثیت سے جو ترکی سلطنت کے اندر بین الاسلامی اتحاد پیدا کر سکے خلافت بیکار ثابت ہو چکی تھی۔ عبدالحمید کی پالیسی نے لوگوں سے ہوا بنا کر شریف کو ڈرا کے مہلک نتائج پیدا کر دیے تھے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جہاد کے اعلان کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ مگر سب سے بڑی چیز جس نے لوگوں کو خلافت سے بیزار کر دیا یہ تھی کہ ایسے نازک وقت میں جب ترکوں کی جان پر بنی ہوئی تھی وحید الدین کی فوجیں جو افواج خلافت کہلاتی تھیں، ان کا گلا گھونٹنے کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ سب سے زیادہ اور پھر شدت سے ۱۹۲۳ء میں جمہوریت کا اعلان [illegible] قریب جس میں ہر گروہ شامل تھے مگر یہ بات ظاہر تھی کہ مجلس بنیادی معاملات میں متفق ہے کہ چیزوں میں اختلاف رائے موجود ہے مگر کسی کا نام نہیں [illegible]

اتنا کہوں گی کہ جمہوری پارٹی میں ایک تدریج پسند اور حریت پسند جماعت تھی جو بڑی سختی کے ساتھ دستوری اور آئینی طرز حکومت کی حامی تھی جس بات میں وہ سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ تعلیم اور طرز معاشرت کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش زور شور سے جاری رہنی چاہیئے۔ مگر تدریج پسندوں کا خیال تھا کہ یہ مقصد آئینی طریقوں کا پابند رہ کر حاصل ہو سکتا ہے اور انتہا پسند یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ایک پارٹی کی استبدادی حکومت نہ ہو اور انتہائی ذرائع اختیار نہ کئے جائیں اس کا حاصل ہونا محال ہے۔ بہرحال ۱۹۲۳ء کے آخر تک ان میں آپس میں پھوٹ نہیں پڑی اور انھوں نے اپنی اصلاحات جاری رکھیں۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں مجلس نے چند قوانین منظور کئے جنھوں نے ریاست اور مذہب کی تفریق کو مکمل کر دیا۔ پہلے قانون کی رو سے شیخ الاسلام کا عہدہ توڑ دیا گیا اور امور مذہبی کا محکمہ وزیر اعظم کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ وزارت اوقاف توڑ دی گئی اور اس کا کام وزارت مالیات کے سپرد کر دیا گیا جو مذہبی مدارس اوقاف کے ماتحت تھے وہ بند کر دئیے گئے۔

ان سب قوانین کی منظوری تدریج پسندوں اور انتہا پسندوں کے اتفاق رائے سے ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست اور مذہب کی تفریق جس کی تاریخی نقطۂ نظر سے ہم آگے چل کر دکھائیں گے ایسی چیز تھی جس کی ضرورت عام طور پر تسلیم کر لی گئی تھی۔ اس قانون پر کھلا ہوا اعتراض یہ ہے کہ گو اس نے ریاست کو مذہب کے سیاسی اثر سے آزاد کر دیا مگر مذہب ریاست کے سیاسی اثرات کا پابند کر دیا گیا۔

جو لوگ ابتدا میں مذہب اور ریاست کی تفریق کے حامی تھے انھیں یہ امید تھی کہ مذہب آزاد ہو جائے گا اس میں خالص روحانیت کی شان پیدا ہو جائے گی اور وہ پہلے کی طرح لوگوں کی اخلاقی تعلیم و تہذیب کا کام انجام دے گا مگر نئے قانون کی رو سے ترکی میں عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہبی امور میں بالکل آزاد ہیں اور مسلمانوں کا مذہب حکومت کا دست نگر ہے۔

۱۹۲۵ء میں مجلس میں پھر دو پارٹیاں ہو گئیں۔ تدریج پسند پارٹی اور جمہور کی پارٹی۔ اسی سال کردوں نے بغاوت کی اور ان کو سزا دینے کے لئے انقلابی عدالتیں قائم کی گئیں اس ہنگامے میں حکومت کو موقع مل گیا کہ تدریج پسند پارٹی کو توڑ دے ۱۹۲۵ء سے ترکی جمہوریہ پر ایک ہی پارٹی یعنی جمہور کی پارٹی حکومت کر رہی ہے۔

یہاں سے ترکی ریاست کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جسے انتہا پسندی کا دور کہنا چاہیئے۔ اصلاحات کا سلسلہ بڑی سختی سے جاری رکھا گیا۔ ان میں سے دو اصلاحیں اتنی اہم ہیں کہ ممکن ہے وہ ترکوں کے طرز خیال اور طرز معاشرت کو بالکل بدل دیں:-

۱۔ ۱۹۲۶ء میں سوئٹزرلینڈ کے قانون دیوانی کا ترکی میں نفاذ۔

۲۔ ۱۹۲۸ء میں لاطینی رسم الخط کا اختیار کیا جانا۔

رسم الخط کے مسئلے کا ذکر ہم اگلے لیکچر میں اصلاحات کی ذیل میں کریں گے۔ یہاں

ہم قانون کے مسئلے پر ایک تاریخی نظر ڈالتے ہیں کیونکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی کے مسلمانوں اور دوسرے مسلمان بھائیوں کے طرزِ خیال میں کیا فرق ہے۔

اسلامی شریعت اسلام ایک ضابطہ ہے جو تمام انسانوں کے باہمی تعلقات کو معین کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں۔ عثمانی ترکوں نے اسے اختیار کر کے اس کی بنیاد پر ایک مکمل اور آزاد عدالتی نظام قائم کیا تھا۔ یہی صورت اور اسلامی ریاستوں کی بھی تھی۔ لیکن اور ریاستوں نے تو اس کی اصلی شکل قائم رکھی یعنی وہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کی جسے شریعت کہتے ہیں، پابند رہیں مگر عثمانی ترک وقتاً فوقتاً شریعت میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا اضافہ کرتے رہے۔

سولھویں صدی کے آغاز میں سلیمان اعظم نے قانونِ فوجداری، قانونِ اراضی اور قانونِ تجارت کا ایک خاکہ بنایا اور اُسے ملک میں نافذ کیا۔ یہ انسانی قوانین شریعت میں ضم کر دئے گئے اور ان کا نفاذ بدستور شیخ الاسلام اور اُن کی ماتحت شرعی عدالتوں کے ہاتھ میں رہا۔

اُنیسویں صدی کے شروع میں ارباب "تنظیمات" نے اس نئے مغربی تمدن سے متاثر ہوکر، جو انقلاب فرانس کے بعد قائم ہوا تھا اپنے ملک کے عدالتی نظم ونسق میں زبردست تبدیلیاں کیں۔

انھوں نے فرانس کے قانون فوجداری اور قانون تجارت کو بجنسہٖ اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۶ء تک قانون دیوانی کی تدوین اور انضباط کا کام بہت

بڑے پیمانے پر ہوتا رہا جس کی بدولت مشہور و معروف عثمانی ضابطہ دیوانی ظہور میں آیا۔ اس کی ظاہری شکل مغربی قوانین کی سی تھی یعنی یہ باقاعدہ ابواب اور دفعات میں تقسیم کیا گیا تھا مگر حقیقت میں اس کی بنا اسلامی شریعت پر رکھی گئی تھی۔ ظاہری شکل کے علاوہ ایک مغربی عنصر اس میں یہ بھی تھا کہ اس کا نفاذ ریاست کی طرف سے کیا گیا۔ یہ قانون ملک کا عام قانون بنا دیا گیا اور تمام عثمانی رعایا خواہ وہ کسی مذہب و ملت کی ہو اس کی پابندی کرنے لگی۔

اسلام کی رواداری مسلّم ہے اس کا حکم ہے کہ ریاست کو کسی شخص کے مذہب میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے خاندانی امور یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ میں جس طرح مسلمانوں کے مقدمات شرعی عدالتوں میں فیصل ہوتے تھے جو شیخ الاسلام کے ماتحت تھیں، اسی طرح دوسری ملتوں کے مقدمات کا فیصلہ ان کی مذہبی جماعتوں کے سپرد تھا۔ دوسرے معاملات کے فیصلے کے لئے تنظیمات نے عدالت ہائے نظامیہ قائم کیں اور قانون انصاف کی ایک علیحدہ وزارت بنا دی گئی۔ غرض ۱۸۵۶ء سے ملکی قانون کا نفاذ بہ استثناء خاندانی امور کے غیر مذہبی عدالتوں کے ذریعے سے ہونے لگا۔ ابتدائی عدالتوں اور عدالت ہائے اپیل میں عیسائی جج اور مسلمان جج ساتھ ساتھ بیٹھ کر مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں عثمانی ترکوں کا اصول قانون کے بارے میں یہ تھا:

۱۔ تجارتی کاروبار اور جرائم ایسی چیزیں ہیں جن کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے

ان کے متعلق قانون بنانا ریاست کا کام ہے۔ وہ حسب ضرورت موجودہ قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکتی ہے یا دوسری ریاستوں کے قوانین اختیار کر سکتی ہے۔

۲۔ فرد کے تعلقات ریاست سے اور دوسرے افراد سے، یعنی وہ تمام اُمور جو قانون دیوانی کی ذیل میں آتے ہیں، ریاست ہی کو فیصل کرنے چاہئیں مگر ان کے لئے جو قانون وضع کیا جائے اس کی بنا اسلام کے احکام پر اور شریعت کے قوانین پر ہونی چاہئے۔

۳۔ انسانی معاشرت کے بنیادی مسائل یعنی خاندانی اُمور کا فیصلہ ہر ملت کو خود کرنا پڑے گا۔

غرض عثمانی مسلمان ترک مجموعی حیثیت سے انسان کے بنائے ہوئے قانون کے حامی تھے مگر اس جدت پسندی کے باوجود اتنی قدامت پسندی ضرور تھی کہ وہ افراد کے باہمی تعلقات کے بارے میں شریعت کو اپنا رہنما بنانا چاہتے تھے۔

نوجوان ترک

نوجوان ترکوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے شرعی عدالتوں کو شیخ الاسلام کے ہاتھ سے نکال کر وزارتِ قانون انصاف کی ماتحتی میں دے دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے خاندانی امور کے متعلق ایک نیا قانون وضع کیا مگر اس میں لفظاً نہیں تو معناً شریعت ہی کے احکام کو مدنظر رکھا اور پھر پرانے شرعی قانون کو بھی منسوخ نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو یہ اختیار دیا کہ اپنے خاندانی معاملات (خصوصاً شادی وغیرہ) میں خواہ پرانے قانون پر عمل کریں خواہ نئے قانون

اس کا ذکر ہم اس لکچر میں کریں گے جو عورتوں کے متعلق ہے۔ ان سب قوانین کو سلطان نے ۱۹۰۹ء میں منسوخ کر دیا۔

جمہوریہ کی قانونی اصلاحیں | جمہوریہ کی قانونی اصلاحات ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی تحت میں آ جاتی ہیں یوں تو انیسویں صدی کی اصلاحات اُس زمانے کے لحاظ سے ان سے کہیں زیادہ انقلاب انگیز تھیں مگر جمہوریہ نے سوستانی ضابطۂ قانون کو خصوصاً اس حصے کو جو خاندانی امور کے متعلق ہے، اختیار کر کے ترکی قانون کی رُوح کو بدل دیا۔ اس لئے کہ اُس نے نہ صرف انسان کے بنائے ہوئے قانون کو اختیار کیا بلکہ اس کا فیصلہ کر دیا کہ کسی قانون یہاں تک کہ قانون وراثت وغیرہ کا بھی اسلامی شریعت پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ یہ مغربیت کا اتنا گہرا رنگ ہے جو کسی ملک کے مسلمانوں نے اب تک اختیار نہیں کیا۔

میں کوئی ماہر قانون نہیں ہوں کہ عثمانی ضابطہ دیوانی اور سوستانی قانون کا مقابلہ کر کے یہ فیصلہ کر سکوں کہ ترکی کے لئے کون زیادہ مناسب ہے۔ مگر میں یہاں ایک سوال کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو مغربی ملکوں میں تقریر کرتے وقت مجھ سے عموماً پوچھا جاتا ہے وہ جب اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ضابطہ قانون بھی ہے تو پھر کیا ترک اسلام سے خارج نہیں ہو گئے ؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ خواہ کسی شخص کو موجودہ مختار کل کی حکومت کا طرزِ عمل مجموعی حیثیت سے پسند ہو یا نہ ہو مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس حکومت نے مذہب کی قربانی روحانی روحانی زندگی

میں جو اُس کی حقیقی قلمرو ہے دوبارہ قائم کردی۔ ترکوں کو اپنے مذہب سے انتہائی محبت ہے جتنی اور قوموں کو اس لئے اگر ترکی ریاست ملت اسلامی کو اپنی اخلاقی اور روحانی نشو ونما میں آزاد چھوڑ دے اور سیاست کے مہلک اثرات سے محفوظ رہنے دے تو کوئی تعجب نہیں کہ مسلمانوں کی حقیقی مذہبی اصلاح کے آغاز کا شرف بھی ترکی کو حاصل ہو۔

اقتصادی زندگی میں جمہوریہ نے ریاست کی مداخلت کو اور بڑھا دیا۔ صنعت وتجارت کے بہت سے شعبوں کا اجارہ ریاست نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ بنک سب سرکاری یا نیم سرکاری ہیں جن کی وجہ سے ملک کا کاروبار ایک مرکز کے ماتحت ہے اور قومی صنعتوں کی ترقی میں بہت مدد ملتی ہے خارجی پالیسی میں ترکی ریاست کا رجحان صریحاً صلح پسندی کی طرف ہے اور اس نے اپنے پُرانے دشمنوں سے معاہدے کر لئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مشرقِ ادنیٰ میں امن و امان قائم کرنے میں اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

خاتمہ | عثمانی ترکوں کے نظام ریاست میں سات سو سال سے مشرق اور مغرب کی جو کشمکش جاری تھی اس میں مغرب کو فتح حاصل ہوئی آپ اسے اچھا سمجھئے یا برا سمجھئے مگر واقعہ یہی ہے اب رہی روحانی زندگی، وہ کوئی ایسا پودا نہیں جو ایک جگہ سے اُکھاڑ کر دوسری جگہ لگا دیا جائے۔ وہ اپنی زمین سے اُگتا ہے اور اُسی میں پنپتا ہے۔ اس کا مطالعہ ہم آیندہ دو لکچروں میں ترکی ادبیات کے سلسلے میں کریں گے۔

پانچواں خطبہ

خواتین اور حضرات!

عثمانی ترک نسل کے اعتبار سے اہل امریکہ کی طرح ایک معجون مرکب تھے یونانی، سلافی، اطالوی، ہنگاری، البانی، چرکسی اور مشرق ادنیٰ کی دوسری نسلیں انفرادی یا اجتماعی طور پر مذہب اسلام اور ترکی معاشرت اختیار کرکے عثمانی ترکوں میں جذب ہوگئیں۔ اس لئے سوائے اناطولیہ کے خانہ بدوشوں کے جو عموماً آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں اصلی ترک بہت کم ہیں۔ مگر سب ترکوں میں خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی مقیم ہوں یا خانہ بدوش نسلی اور قومی اتحاد کا قوی احساس موجود ہے اور اس احساس کی بنیاد ان کی زبان پر قائم ہے۔

ترکی زبان | باوجود ان خارجی اثرات کے جو مختلف زمانوں میں الفاظ اور خیالات کے اعتبار سے ترکی زبان پر پڑتے رہے وہ اپنی ساخت اور خصوصیات میں دوسری زبانوں سے بالکل الگ ہے۔

ابتدا | ترکی زبان یورال۔ التائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جسے تورانی

خاندان بھی کہتے ہیں۔ اس میں فنستانی، ہنگاری، تاتاری اور عالباً جاپانی زبان بھی شامل ہے۔ گو اس میں ایک بڑی سامی زبان یعنی عربی کے بہت سے خیالات اور لغات دخیل ہو گئے اور ایک ہند۔ یورپی آری زبان یعنی فارسی کے الفاظ بھی رل مل گئے۔ پھر بھی اس کی صرف ونحو اور اس کی اصل سے لئے نہیں بدلی۔ البتہ ان خارجی عناصر کی بدولت اس میں وہ وسعت، گہرائی باریکی اور تنوع پیدا ہو گیا جو دنیا کی تمام مخلوط زبانوں میں پایا جاتا ہے میکس ملر لسانیات کا ایک جید عالم تھا اور اس نے ترکی زبان کا علمی نظر سے مطالعہ کیا تھا وہ اپنی کتاب "علم اللسان" میں جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی تھی کہتا ہے "محض ترکی صرف و نحو کے مطالعے میں خواہ اُس سے زبان کی تحصیل مقصود ہو یا نہ ہو، بہت لطف آتا ہے۔ صیغوں کی تشکیل، اسم اور فعل کی تصریف، اس خوبی سے کی گئی ہے اور جملوں کی ساخت اس قدر سہل اور سادہ ہے کہ یہ زبان عقل انسانی کا ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے"۔

زبان قوموں کی زندگی کا آئینہ ہے اگر ہم ترکوں کی قومی خصوصیات کا اندازہ کرنے کی غرض سے ان کی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ گو ترکی میں فرانسیسی اور عربی کی منطقی صحت اور ہندسی ترتیب نہیں ہے مگر اپنی فطری وضاحت اور متانت کی بدولت وہ جذبات اور خیالات کا اظہار کم سے کم الفاظ میں کرتی ہے اور ایجاز و اختصار میں ان زبانوں سے کسی طرح کم نہیں اُس میں وہ فلسفیانہ پیچیدگی وہ گہری داخلیت، اور مرصع رنگینی جو فارسی زبان میں ہے نہیں پائی جاتی۔ مگر وہ

قلب انسانی کے نازک ترین جذبات اور کیفیات کی ترجمانی اور حسن فطرت کی مصوری کر سکتی ہے جس میں فارسی کی سی صنعت گری تو نہیں مگر حقیقت نگاری کا کمال ہوتا ہے۔

ابتدائی دور | ترکی زبان کی ترقی کا زمانہ تو عثمانی عہد ہے مگر پچھلے پچیس برس میں ہمارے ادب اور ہمارے خیالات پر ترکی تاریخ کے قبل اسلامی دور کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ یہاں اس دور کی خصوصیات اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری ہے۔

ترکی زبان کی سب سے قدیم تحریر، جس کا اب تک پتہ چلا ہے، ارخون کے تاریخی کتبے ہیں۔ ان کا ذکر میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ علاوہ ان کے بے شمار قصے، کہانیاں اور رزمیہ نظمیں زبانی چلی آ رہی ہیں جو شہروں میں اور اناطولیہ کے دیہات میں مائیں بچوں کو سنایا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اوغز نامے کو پیش کرتے ہیں جو اب تک اپنے قدیم نام سے مشہور ہے اور اپنی اصلی شکل میں موجود ہے یہ وہی بھورے بھیڑیے کی حکایت ہے جس نے ہماری تاریخ کے موجودہ دور کی تمثیل کی حیثیت سے اس قدر شہرت حاصل کی ہے۔

"جب اوغز پیدا ہوا تو اس کا چہرہ آسمان کی طرح نیلا، منہ آگ کی طرح لال تھا۔ اس کی کالی آنکھیں، کالے بال اور کالی بھویں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ پہلی بار ماں کا دودھ پیتے ہی وہ بولنے لگا اور اس نے کھانا مانگا۔

چالیسویں دن وہ چلنے پھرنے کھیلنے کودنے لگا اس کے پاؤں بیل کے سے،
اس کا بدن بھیڑئیے کا سا اور اس کا سینہ ریچھ کا سا تھا۔ اس نے جنگلی گھوڑوں
کو ساتھ لے کر دھڑلے سے شکار کھیلنا شروع کر دیا۔"

اس کے بعد اژدہوں کے مارنے کا ذکر ہے جو سب کہانیوں میں ہوا کرتا
ہے اور آخر میں اوغز کی شادی آسمانی دوشیزہ سے ہو جاتی ہے۔

"ایک دن اُوغز تنگری (خدا) سے دعا مانگ رہا تھا کہ یکایک اندھیرا چھا گیا
اور آسمان سے ایک نیلی روشنی نازل ہوئی جس کی چمک چاند اور سورج کو شرماتی
تھی۔ اوغز اُس روشنی کی طرف بڑھا اور اُس نے دیکھا کہ اس کے اندر ایک حسین
لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے کے گرد ایک ہالہ تھا جیسا قطب تارے
کے گرد ہوتا ہے اُس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جب وہ روتی تھی تو نیلا آسمان اس کے
ساتھ روتا تھا اور جب وہ ہنستی تھی تو نیلا آسماں اُس کے ساتھ ہنستا تھا۔"

اوغز کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ تھے۔ دن، چاند، تارا، آسمان،
پہاڑ، سمندر۔ یہی بڑی بڑی سلطنتوں کے بانی ہوئے ترکی میں آج کل یہ نام بہت
کثرت سے رکھے جاتے ہیں۔

اوغز ایک لڑائی میں دشمنوں کے نرغے میں گھر گیا اور ایک بھورے بھیڑیئے
نے آسمان سے اُتر کر اُسے بچایا۔ اس کا ذکر اور کہانیوں میں بھی آتا ہے۔ اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ترکوں میں بھیڑیا ترکی نسل کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ ان کے

جھنڈے پر سنہرے رنگ کے بھیڑیے کا سر بنا ہوتا تھا۔ بھورے بھیڑیے کی سب سے قدیم حکایت ایک چینی کتاب میں ہے۔

"ہوکیونوم پہلے مغربی سمندر کے ساحل پر رہا کرتی تھی۔ ایک ہمسایہ قوم نے اس کا خاتمہ کر دیا صرف ایک لڑکا جو ہاتھ پیر کاٹ کر دلدل میں ڈال دیا گیا تھا۔ بچ رہا۔ ایک بھیڑیے کی مادہ اس کی خبر گیری اور خدمت کرتی رہی۔ ایک اور قوم کے سپاہی آئے مگر دیوتاؤں کی مدد سے بھیڑیے کی مادہ اس لڑکے کو لے کر مشرقی سمندر کے ساحل پر پہنچی اور پہاڑوں پر چڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ایک بھٹ میں رہنے لگی۔ ان دونوں کے دو بچے ہوئے ان میں سے ایک، جس کا نام آسنا تھا بڑا عقلمند تھا۔ وہ بڑا ہوکر اس ملک کا بادشاہ ہو گیا۔ اپنی پیدائش کی یادگار میں وہ ایک جھنڈا جس پر ایک بھیڑیے کا سر بنا ہوا تھا اپنے خیمے کے دروازے پر لٹکایا کرتا تھا۔"

قومی رسوم سے متعلق ادب | ترکوں کی قدیم موسیقی اور ادب کا تعلق بعض رسوم سے تھا جو اب تک چلی آ رہی ہیں گو ان کی شکل بدل گئی ہے۔ ان سب رسموں میں مغنی شاعر ایک ساز پر جو "کبوز" کہلاتا تھا، اپنے شعر گایا کرتے تھے یہ دستور اُدھر پانچویں صدی میں ایشیا میں رائج تھا اور ادھر سترھویں صدی تک بلقان میں پایا جاتا تھا اور کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی اناطولیہ میں موجود ہے

سغر | ان میں سے پہلی رسم سغر کہلاتی ہے اور شکار سے متعلق ہے یہ عثمانی عہد تک

جاری رہی کیونکہ عثمانی ترک بھی ابتدائی دور میں شکار کے بڑے شائق تھے شکار کے بعد محفل طرب آراستہ ہوتی تھی اور مغنی شاعر نغمہ سنجی کی داد دیتے تھے۔

شولون | ایک اہم رسم ہبلوں کی قربانی ہے قدیم زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ قربانی کے وقت دیوتا آکر انسانوں سے باتیں کرتے ہیں۔ جب ترکوں نے اسلام قبول کیا تو اس رسم کا خاتمہ ہوگیا۔

یُغ | مردوں کے ماتم کی رسم بھی بہت اہم تھی اس موقعے پر مرثیے پڑھے جاتے تھے مُغنّی شاعر یا تو اپنی طرف سے مرنے والے کے اوصاف بیان کرتا تھا یا مرنے والے کی زبان سے اس کی داستان سناتا تھا۔ اس میں مظاہر فطرت بھی شریک کرلئے جاتے تھے۔ پہاڑ، چٹانیں، بادل انسانوں کی طرح بولتے تھے روتے تھے، گاتے تھے۔ فطرت کی گویائی کا تصور عثمانی عہد کی کہانیوں اور رزمیہ نظموں میں بھی عام طور پر پایا جاتا ہے۔ مرنے والے کے گھوڑے کو بھی ان مرثیوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُسے جلادیتے تھے اور مالک کی لاش کے ساتھ دفن کردیتے تھے۔ ادب کی یہ صنف یعنی مرثیہ ترکوں کے حصّے کی چیز ہے۔ اور ماتم کے اسلامی طریقے یعنی دعائیں مانگنا، قرآن کی تلاوت کرنا اور میلاد پڑھنا ترکوں کی قومی زندگی کے اہم اجزا بن گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مذہب کو ترکوں کی زندگی میں بہت بڑا دخل تھا جیسا کہ ابتدائی دور میں ہر قوم کی زندگی میں ہوتا ہے۔ اس رنگ میں انھوں نے اعلیٰ درجہ کا ادب

پیدا کیا ہے۔ مسئلۂ آفرینش کے متعلق التائی کے ترکوں کے یہاں ایک نظم ہے جس کے مضمون میں بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے۔

"دنیا کے پیدا ہونے سے پہلے سب کہیں پانی ہی پانی تھا۔ نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ چاند، نہ سورج۔ زندگی کے سرچشمے، انسانوں کے مالک تنگری قارا خان نے اپنی شکل کا ایک پیکر بنایا اور اس کا نام انسان رکھا۔ تنگری قارا خان اور انسان کالے ہنس بن کر سطح آب پر اڑتے پھرتے تھے مگر انسان کو وہ خوشی جو خاموشی میں ہوتی ہے، پسند نہ تھی۔ اس نے کوشش کی کہ فضائے آسمانی میں اونچا اڑتا چلا جائے مگر اس کی طاقت نے جواب دے دیا اور وہ پانی کی نامحدود گہرائی میں گر گیا۔ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے تنگری قارا خان سے مدد مانگی۔ تنگری قارا خان نے حکم دیا کہ ابھر کر سطح آب پر آ جا اور انسان ابھر آیا۔

"چونکہ اب انسان اڑنے سے معذور ہو گیا تھا اس لئے تنگری قارا خان نے چاہا کہ اس کے لئے زمین بنا دے۔ اس نے انسان کو حکم دیا کہ پانی کی تہ میں جا اور وہاں سے مٹی لے آ۔ جب انسان اپنے منہ میں مٹی بھر کر لایا تو اس نے تھوڑی سی مٹی اپنے منہ میں بچا رکھی تاکہ اپنی ایک الگ دنیا بنا لے۔ مگر مٹی پھول کر اس کے گلے میں پھنس گئی اور تنگری قارا خان نے حکم دیا کہ اسے تھوک دے۔ اس مٹی کی وجہ سے جو انسان کے منہ میں تھی وہ سانس نہیں لے سکتا تھا"

"زمین جو تنگری قارا خان نے پیدا کی تھی، بالکل سپاٹ تھی۔ مگر جب انسان کے منہ سے مٹی گری تو زمین پر دلدل اور پہاڑ بن گئے۔

"تنگری قارا خان نے خفا ہو کر نا فرمان انسان کا نام "ارلیق خان" رکھا اور اسے نور کے دائرے سے خارج کر دیا۔"

ارلیق خان شیطان کا جواب ہے اور یہ ترکی ادب کی جدت ہے کہ یہاں شیطان فرشتہ نہیں بلکہ پہلا انسان مانا گیا ہے

"جب ارلیق خاں نے دیکھا کہ زمین کے نئے باشندے خوب صورت اور نیک ہیں تو اُس نے تنگری سے کہا کہ انھیں میرے حوالے کر دے۔ تنگری قارا خاں نے انکار کر دیا مگر ارلیق کو ایسا ڈھب آتا تھا کہ وہ انھیں بہکا کر بری راہ پہ لگا کر اپنے قابو میں لے آتا تھا۔ تنگری قارا خاں نے خفا ہو کر انسانوں کو اِن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اُس نے ارلیق خان پر عذاب نازل کیا اور اُسے زمین کے نیچے تیسرے طبقے میں جو ذلت کا گھر تھا ڈھکیل دیا۔"

خدا اور شیطان، حق اور باطل کی لڑائی بڑی خوبی سے دکھائی گئی ہے اور اس کا خاتمہ حق کی فتح پر ہوتا ہے۔ قدیم زبان کے لطف کے علاوہ اس میں اول سے آخر تک لطیف ظرافت کی چاشنی ہے اور انسانی فطرت کی کمزوری پر ہمدردی سے نظر ڈالی گئی ہے۔

پوٹانین نام ایک روسی عالم نے مغلوں اور ترکوں کی اساطیر کا مطالعہ کیا ہے وہ انھیں شمالی ایشیا کی اساطیر میں شمار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ چیزیں اتنی پرانی ہیں کہ قدیم یہودی، جنھوں نے تورات کو ترتیب دیا، ان سے متاثر ہو چکے تھے

اور سلافیوں، فنستانیوں اور جرمنوں کی کی پہلی رزمیہ نظمیں بھی ترکوں اور مغلوں سے ماخوذ ہیں۔

اس کے علاوہ ترکوں کے یہاں اخلاقی نظمیں اور کہاوتیں بہت کثرت سے موجود تھیں۔

عام خصوصیات | ترک اپنے ساتھ جو ادب مشرق ادنیٰ میں لائے اس کی سب سے نمایاں خصوصیتیں دو ہیں، مضمون آفرینی اور تند و تیز اور نرم و رقیق جذبات کی آمیزش۔ ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترکوں کی اخلاقی سیرت اُس زمانے کے لحاظ سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ ایک اور چیز جس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے یہ ہے کہ اُن کے ادبی کارنامے شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہیں۔ ان میں سے کسی کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری جماعت کے نتائج افکار ہیں۔

ان سب میں چند صفات پر بہت زور دیا گیا ہے، مہمان نوازی، فیاضی، والدین کی عزت و حرمت اور سب سے بڑھ کر راست گوئی پر۔ ظاہر ہے کہ یہ عام انسانی صفات ہیں، کچھ ترکوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ دو چیزوں میں ترکوں کو ہمیشہ سے امتیاز حاصل ہے اور ان میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ایک تو یہ موقع پر کمزور کی مدد کرنا جس کا عثمانی ترک خاص طور پر خیال رکھتے تھے ان کی ریاست کے آغاز کے متعلق جو حکایت مشہور ہے اس میں اصل نکتہ یہی ہے اُن کی تاریخ میں ابتدا سے انتہا تک یہ رجحان غالب رہا ہے، پولینڈ کے ساتھ

انھوں نے جو سلوک کیا اور ہنگری کے مظلوموں کو جس فراخدلی سے پناہ دی وہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ معلوم نہیں یہ صفت ان میں آیندہ بھی باقی رہے گی یا نہیں، دوسری چیز جوان کے حصے میں آئی ہے یہ ہے کہ وہ اہل اسپارٹا کی طرح انتہائی مصیبت میں بھی صبر و استقلال سے کام لیتے ہیں۔ قوم پروروں کی جدوجہد میں اس کی صدہا مثالیں نظر آتی ہیں۔

جب ترکوں نے اسلام اختیار کیا تو ان کے ادب میں نئے مذہب کا رنگ جھلکنے لگا مگر اس کی بنیادی خصوصیتیں بدستور باقی رہیں۔

سلجوقی عہد اناطولیہ میں | مشرقِ ادنیٰ میں ترکی ادب کی جتنی نئی تحریکیں شروع ہوئیں ان سب کا آغاز سلجوقی عہد میں ہوا۔ اس لئے ہم اسے عثمانی عہد کا ابتدائی دور قرار دیتے ہیں۔ اُس کے شباب کا زمانہ تیرھویں صدی ہے جب سلجوقیوں کی ریاست معرضِ زوال میں تھی۔ ادب کی بڑی تحریکیں، خصوصاً وہ جن پر روحانی اور فلسفیانہ رنگ غالب ہو، عموماً ایسے ہی زمانہ میں اُٹھتی ہیں جب ریاست کمزور ہو جائے اور اس کا پنجہ استبداد ڈھیلا پڑ جائے آج کل چند نوجوان ترکی ادیب سلجوقی عہد کا خاص طور پر مطالعہ کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک جو معلومات حاصل ہوئی ہے وہ نامکمل ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے اس لئے کہ سلجوقی عثمانیوں سے حکمرانی اور سیاست میں بہتر نہ ہوں مگر علم و ادب میں ضرور بہتر تھے۔

زبان | ترکوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور علمی زبان عربی۔ مگر عوام میں ترکی

رائج تھی اور اوسط درجے کے معلمین اور انشا پردازوں کی ایک جماعت تمام بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ اور شرح ترکی میں کرتی تھی تاکہ وہ عوام میں اشاعت پائیں۔ سرکاری علما اور غیر سرکاری علما کی اصطلاحیں جن کا ذکر ترکی تاریخ میں ہر دور میں آتا ہے اسی زمانے سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر غیر سرکاری علما کا اثر جو اس دور میں تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

ہم یہاں سلجوقی عہد کی ادبی جدوجہد کے تین پہلوؤں پر جو سب سے اہم ہیں نظر ڈالیں گے۔

مذہبی ادب: تیرھویں صدی میں زندگی کے اور سب شعبوں کی طرح علم و ادب پر بھی مذہب کا اثر غالب تھا اس میں اور زیادہ شدت اس وجہ سے ہوگئی کہ مشرق ادنیٰ کے ترکوں کو صلیبی جنگوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ترکوں کا قدیم نعرۂ جنگ "ارہا" جو انگریزوں کے یہاں "ہُرا" بن گیا ہے ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ تکبیر کے نعرے گونجنے لگے۔ ترکوں کی رزمیہ شاعری مذہبی رنگ میں ڈوب گئی۔ لوگ اُن سورماؤں کے گیت گانے لگے جو عیسائیوں کی فوجوں سے لڑے تھے۔ رزمیہ نظموں میں سب سے زیادہ مقبولیت "بطّال غازی" کی داستان کو حاصل ہوئی۔ اس میں اِن جنگوں کا ذکر ہے جو بازنطینی عیسائیوں سے ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہ داستان ہے جو عثمانی ترکوں کی ینی چری فوجوں کو پڑھائی جاتی تھی تاکہ ان کے دل میں شجاعت اور جانبازی کا ولولہ پیدا ہو۔

غیر مذہبی ادب | جانوروں کے قصے بہت کثرت سے رائج تھے۔ عشق و محبت کے افسانے عموماً قدیم زمانے کے متعلق ہیں ان میں مظاہر فطرت انسانوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں اور عورتوں کی طرف شجاعت و مردانگی کے بڑے بڑے کارنامے منسوب کئے جاتے ہیں یہ ترکی ادب کی قدیم خصوصیت ہے اس دور کے آخر میں اور عثمانی سلطنت کے آغاز میں نئے طرز کی نیم سیاسی رزمیہ نظمیں لکھی جانے لگیں جن کا موضوع فرد اور ریاست کی جنگ تھی۔ ان کے ہیرو داستان رابن ہڈ کے طرز کے لوگ ہوتے تھے جو بادشاہ اور اُمراء کے مقابلے میں غریبوں کی حمایت کرتے تھے اس قسم کی نظمیں سمرنا کے نواح میں بہت مقبول تھیں جن لوگوں نے ترکی کا سفر کیا ہے انھیں غالباً یہ معلوم ہوگا کہ سمرنا کے پہاڑی جو زیبک کہلاتے ہیں عجیب و غریب لوگ ہیں۔ وہ ایک طرف تو ہمیشہ عثمانی سلطنت کے استبداد کا مقابلہ کرتے رہے اور دوسری طرف یونانیوں کے حملے کے وقت انھی نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سب سے پہلے ہتیار اُٹھائے۔ اس نواح میں ایک پہاڑی لڑکی کی قبر ہے جس کی زیارت کے لئے سمرنا کے ترک جایا کرتے ہیں۔ وہ ایک سپاہی جتھے کی سردار تھی جو حکومت سے اور اُمراء سے لڑتا تھا اور غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ زیبکوں کا ناچ اور گانا آج کل بہت مقبول ہو رہا ہے ایک گیت جس کا عنوان "حسین پہاڑی" ہے بہت مشہور ہے یہ بالکل قدیم ترکی گیتوں کے رنگ میں ہے جس میں گھوڑے کو بھی اپنے سوار کے رفیق کی حیثیت

سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ جو ساز بجایا جاتا ہے وہ بہت دلکش اور موثر ہے۔

"حسین پہاڑی ایک چٹان کے سہارے کھڑا ہے پانی برس رہا ہے اور اس کے ہتھیاروں میں زنگ لگ گیا ہے۔ وہ دن آتا ہے جب یہ وحشی رام ہو جائے۔ تف ہے تیرے نام پر اے سرنگ گھوڑے! کیا تجھے اس کی ارغوانی صدری پر خون نظر نہیں آتا؟

"سامنے پہاڑوں پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تین سو سوار اور پانچ سو پیادے اس سے لڑنے کے لئے آرہے ہیں حسین پہاڑی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا تف ہے تیرے نام پر اے سرنگ گھوڑے! کیا تجھے اس کی ارغوانی صدری پر خون نظر نہیں آتا؟"

متصوفانہ ادب اور درویشوں کے سلسلے | تیرھویں صدی کا مایہ ناز ادب وہی جو تصوف کے رنگ میں ہے اس کا ماخذ کلام مجید کی وہ آیتیں اور رسول مقبول کی وہ حدیثیں ہیں جن میں باطنی شان پائی جاتی ہے حدیث شریف میں ہے:۔

"كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ"

اور کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے "كُلُّ شَيءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" دوسرے مقام پر ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اور قوموں کے تصوف کی طرح اسلامی تصوف میں بھی وحدت وجود کا عقیدہ موجود ہے اور یہ خیال عام ہے کہ انسان جو ذات

الٰہی کے دریا کا قطرہ ہے ایک دن دریا میں مل جائے گا۔ مشرق ادنیٰ کے تصوف کی نشو و نما پر نسطوری عیسائیوں، مانی کے پیروؤں اور نو فلاطونیوں کا بلا واسطہ اثر اور ہندوؤں کے باطنی خیالات کا جنھیں البیرونی نے عربی میں منتقل کیا۔ بالواسطہ اثر پڑا۔

اس تحریک کے علم بردار تیرھویں صدی میں تین شخص تھے یہ۔

احمد یسوی | یہ ایک سمرقندی ترک تھا جو ایشیائے کوچک میں کبھی نہیں آیا اس کی سب سے اہم تصنیف "دیوان حکمت" ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ پوری کتاب احمد یسوی کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کے بعض حصے الحاقی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب عام فہم ترکی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کا موضوع مابعد الطبیعیات کے پیچیدہ مسائل نہیں بلکہ زندگی کی سیدھی سادی باتیں ہیں اس لئے اس کے خیالات احمد یسوی کے شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے سے لوگوں میں بہت جلد پھیل گئے۔ احمد کے دو شاگرد سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ حاجی بکتاش اور طاپتق عمرہ یا یونس عمرہ

بکتاشی سلسلہ | کچھ دن کے بعد عثمانیوں کے یہاں درویشوں کا بکتاشی سلسلہ قایم ہوا۔ ینی چری فوج حاجی بکتاشی کو اپنا پیرو مرشد مانتی تھی اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ اس فوج کی قوت اور ضبط و نظم کا راز یہی ہے کہ اس میں درویشی کی روح سمائی ہوئی تھی اور جمہوریت کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود ریاست کے

نظام کا ایک جز ہونے کے وہ ہمیشہ ریاست کے استبداد کی مخالفت کرتی رہی۔ بکتاشی سلسلہ صرف اناطولیہ ہی پر حاوی نہیں رہا بلکہ بلقان میں بھی بہت جلد زور پکڑ گیا۔ اس کا ایک مرکز البانیہ میں بھی تھا ظلم اور استبداد کے خلاف جتنی شورشیں ہوئیں ان سب کو اس سلسلے سے مدد ملی ایک وجہ اس قوت کی یہ بھی تھی کہ وہ شریعت کے پیچیدہ نظام کا سختی سے مخالف تھا۔ وہ خدا کے جلال کے مقابلے میں جمال پر زور دیتا تھا۔ اس نے مذہب کی بنا جبر و قہر کے تصور کے بجائے لطف و محبت کے تصور پر رکھی تھی۔ ترکی زبان کی بہت سی مناجاتیں اور مذہبی نظمیں جن کے مصنفوں کے نام معلوم نہیں اسی سلسلے کے لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ عوام میں قوت تنقید پیدا کرنے میں اس سلسلے کا بڑا حصہ ہے۔ احمد یسوی کے دوسرے نامور شاگرد یونس عمرہ کے متعلق آج کل یہ خیال ہے کہ وہ اپنے عہد میں اناطولیہ کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ بہت سی مناجاتیں جو ہم اپنے بچپن کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے اس کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس نے ارباب ظاہر کے عقاید کا خاکہ اپنی ظریفانہ نظموں میں بڑی خوبی سے اڑایا ہے۔ ان میں سب سے مشہور نظم یہ ہے۔

"میرے مالک میں نے تیری کیا خطا کی تھی کہ تو نے مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی خاطی بنا دیا۔ تیرے ہاتھ میں تھا کہ مجھے جیسا چاہتا بنا تا تو نے تو مجھے "ظلوماً جہولاً" بنا کے رکھ دیا۔ میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کال کوٹھری میں بند ہوں میرے گرد شیطانوں کا نرغہ ہے اور میرے اندر شہوتوں کی دیگ

اُبل رہی ہے۔

"تو نے بال سے باریک پل بنایا اور مجھ سے کہتا ہے کہ گزر جا اور میرا جو انجام پہلے سے مقرر ہے اس سے اپنے آپ کو بچا۔ بھلا انسان بال سے باریک پل سے کیسے گذر سکتا ہے یقینی بات ہے کہ اس کا پیر پھسلے گا اور وہ جہنم رسیدہ ہو جائے گا۔ تیرے بندے جو پل بناتے ہیں وہ لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سیلاب کے وقت آسانی سے گذر جائیں۔ وہ چوڑا اور مضبوط ہوتا ہے کہ اُسے دیکھ کر گذرنے والے کا جی خوش ہو جاتا ہے اور وہ چلّا اُٹھتا ہے دیکھو! یہ ہے صراط مستقیم۔

"تو نے نیک اور بد اعمال کے تولنے کے لئے ایک میزان کھڑی کر دی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ میں سیدھا جہنم میں بھیج دیا جاؤں۔ ترازو بنیوں۔ بقالوں اور سناروں کے یہاں ہوا کرتی ہے۔ تیرے یہاں ترازو کا کیا کام؟ تو حاضر و ناظر ہے۔ میری ساری حرکتوں کو خوب جانتا ہے۔

"گناہ دنیا میں سب سے گندی چیز ہے۔ تو اسے کیوں ناپتا تولتا ہے تجھے تو یہ چاہیئے کہ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے"

درویشوں کے اور بھی بہت سے سلسلے تھے جن کے ناموں سے آپ سب حضرات واقف ہیں۔ سلجوقی سلطنت کے زوال کے زمانے میں ان سب نے لوگوں کے خیالات اور معاشرت پر بہت گہرا اثر ڈالا مگر ادب موسیقی اور

فلسفیانہ خیالات کی نشو و نما میں جتنا بڑا حصہ "مولویہ" کا ہے اور کسی کا نہیں۔

سلسلہ مولویہ کی بنیاد اناطولیہ میں اُن بزرگ نے رکھی جن کی عظمت تمام عالم اسلام میں مُسلّم ہے۔ مولانا بچپن میں اپنے والد کے ساتھ بلخ سے ایران، شام اور مشرقی اناطولیہ ہوتے ہوئے قونیہ آئے تھے۔ ان کے والد بلخ میں رہتے تھے مگر یہ امر ترکوں اور ایرانیوں میں مابہ النزاع ہے کہ ان کا اصلی وطن کہاں تھا۔ بہرحال ان کی والدہ خوارزم کے شاہی خاندان سے تھیں۔ سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد نے مولانا اور ان کے والد کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میرے خیال میں ان کے وطن کے متعلق جو نزاع ہے وہ اس بنا پر ہے کہ ان کی شہرہ آفاق مثنوی فارسی میں ہے حالانکہ فارسی اور عربی ایران اور عرب کے باہر بھی مسلمانوں کی علمی زبانیں سمجھی جاتی تھیں اور بڑی بڑی کتابیں عموماً انھیں زبانوں میں لکھی جاتی تھیں۔ اور مولانا کی تصانیف تو فارسی کے علاوہ ترکی، عربی بلکہ یونانی زبان میں بھی موجود ہیں۔ مولویہ سلسلہ عوام میں بھی ہر دل عزیز تھا مگر ترکی میں اس کے اندر زیادہ تر ارباب علم و ہنر اور امراء داخل تھے۔ قونیہ کا چلپی سلطان کی تاج پوشی کے وقت اس کی کمر میں پٹکا باندھا کرتا تھا اور قوم میں اس کا بہت بڑا مرتبہ تھا

اسلامی اور مشرقی تصوف کی خصوصیات میں سے ترک تو معرفت الہی کے اخلاقی اور اجتماعی پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے اور ایرانی اس کے جمالی اور

فلسفیانہ پہلو پر۔ اس معاملے میں غالباً ایرانی تصوف، ہندی تصوف سے زیادہ قریب ہے گو ترکی صوفیوں میں مولانا کے یہاں ایرانی رنگ سب سے زیادہ ہے۔ پھر بھی انھوں نے تصوف کے اخلاقی اور معاشرتی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ اناطولیہ میں ایک حکایت مشہور ہے جس سے ترکوں کی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ جب شیخ سعدی نے گلستاں لکھی تو سب سے پہلے مولانا کے پاس بھیجی۔ مولانا نے اس کے سرورق پر لکھ دیا "بے نمک است"۔ جب شیخ سعدی نے یہ دیکھا تو مولانا کو لکھ بھیجا "ولاکن حلوا است"۔ مولانا معنی کا نمک چاہتے تھے اور شیخ کو صورت کے حسن و حلاوت کی فکر تھی۔

محی الدین عربی مولانا کے ہم عصر تھے۔ وہ اندلس کے رہنے والے تھے مگر جب اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ مسلمانوں پر بے حد ظلم کرنے لگے تو قونیہ چلے آئے اور ایک ترکی عورت سے شادی کر کے یہیں رہنے لگے۔ اُن کے سوتیلے بیٹے اور شاگرد صدرالدین قونوی نے ان کی کتابوں کی شرح لکھی اور ان کے خیالات کی اشاعت کی۔ یورپ میں آج کل ان کا نام اس وجہ سے مشہور ہو گیا ہے کہ اسپین کے ایک مصنف مسگول آسین پالکنوس نے اپنی کتاب میں جو ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی، یہ دعوی کیا کہ دانتے کی "ڈوائین کامیڈی" محی الدین عربی کی کتابوں سے اور ابوالعلاء المعری کی کتاب الغفران سے ماخوذ ہے

ایک نظم جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ مولویہ فرقے کے خیالات کا

اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔

"اُدھر آ اے درویش بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی چھوڑ دے یقین کر کہ جو چیز تو ڈھونڈھتا ہے وہ تیرے ہی پاس ہے۔ اگر تجھے کعبے کی تلاش ہے، اگر تو رحمت اور نجات کا طالب ہے تو یہ سب کچھ تیرے ہی اندر ہے۔

" تو سراب کے پیچھے کب تک مارا مارا پھرے گا۔ اگر تو حق کا جویاں ہے تو اسے کتاب میں نہ ڈھونڈھ چشم بینا پیدا کر اور دیکھ کہ قرآن تیرے ہی اندر ہے۔

" تو اپنے علم سے بڑی بڑی موشگافیاں کرتا ہے آخر تجھے تلاش کس کی ہے؟ تو آپ ہی اپنے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس کائنات کا خالق تیرے ہی اندر ہے۔ تو ایک چیز کو نیک کہتا ہے، دوسری کو بد، ایک کو حق دوسری کو باطل مگر ان میں کوئی فرق نہیں حق اور باطل تیرے ہی اندر ہے۔

" دل کی دنیا کی سیر کر، آفتاب اور ذرے کا مقابلہ کر۔ نیک اور بد کا امکان تجھی میں ہے۔ اگر تو بدی کی طرف مائل ہے تو شیطان تیرے ہی اندر ہے۔

" میں، کو، تو، میں محو کر دے۔ رنگ و بو سیاہی اور سپیدی سے پاک ہو جا۔ نور کا خالق تیرے دل میں جلوہ افروز ہے تو ظلمات میں کیوں بھٹکتا پھرتا ہے آب حیات تیرے ہی اندر ہے۔

" میں سنتا ہوں کہ تو ان باپ کا بیٹا ہے، تو بہشت میں پیدا ہوا تھا مگر وہاں سے نکال دیا گیا۔ تو ناز و نعمت میں پلا مگر اب عسرت میں گرفتار ہے۔ خدا کو کیوں

الزام دیتا ہے۔ بغاوت تو تیرے ہی اندر ہے۔

"تو دوسروں سے کیا مدد چاہتا ہے؟ اگر تو بہشت سے نکال دیا گیا تو کوئی کیا کرے۔ وہ سانپ جس نے حوا کو بہکایا تھا تیرے ہی اندر ہے۔

"تیری خلقت ادنیٰ سہی مگر تیرا جوہر اعلیٰ ہے۔ اگر تو بت پرست ہے تو جسے چاہے پوجا کر۔ اگر تو بادہ عشق سے سرشار ہے تو تیرا معشوق تیرے ہی اندر ہے۔

"اے غافل مظاہر کو حقیقت سمجھ کر ان کی پرستش نہ کر۔ حوادث کا دریا ازل سے ابد تک جاری ہے ازل اور ابد تیرے ہی اندر ہے۔"

معاشی تصوف سلجوقیوں کے زوال کے زمانے میں معاشی زندگی پر بھی تصوف کا رنگ چھا گیا اور اہل حرفہ کی انجمنیں درویشوں کے حلقوں کی شکل میں قائم ہو گئیں جنھیں اخیلر کہتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ انھوں نے تیرھویں صدی میں انگورہ میں اپنی باقاعدہ ریاست قائم کر لی تھی مگر اس کی تاریخی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ پیشہ وروں کی برادریاں تھیں جن کی ابتدا چمڑا رنگنے والوں سے ہوئی تھی اسی قسم کی برادریاں اور بھی بہت دوسرے اسلامی ملکوں اور مغربی ملکوں میں بھی موجود تھیں۔ پندرھویں صدی کی معاشرتی تنظیم کا عام طرز یہی تھا مگر ترکی اناطولیہ میں ان برادریوں نے غیر معمولی طور پر مضبوطی سے جڑ پکڑ لی تھی اور ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان حلقوں کے قائم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو گی کہ سیاسی ابتری اور طوائف الملوکی کے زمانے میں معاشرتی ربط باقی رہتے اور اخلاقی معیار ...

گرنے پائے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں ان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔
"اخیلہ ہر قسم کی لوٹ کے مخالف ہیں نہ وہ رعایا کی غارت گری کو پسند کرتے ہیں نہ
حکومت کے ظلم و جور کو"

ایک فتوت نامے میں لکھا ہے کوئی اخی حاکموں کے دروازے پر بھیک مانگنے
نہ جائے۔ سلطان یا اس کے عمال کو اخی یا شیخ کے وجود کا علم ہی نہ ہونے پائے"
جب کوئی شخص پہلی بار کسی برادری میں داخل ہوتا تھا تو اسے سات بدیوں
سے بچنے کا اور سات نیکیاں اختیار کرنے کا عہد کرنا پڑتا تھا۔ جو استعارے
میں سات دروازے بند کرنا اور سات دروازے کھولنا کہلاتا تھا۔

(۱) بخل کا دروازہ بند کرنا اور سخاوت کا دروازہ کھولنا۔
(۲) ظلم و جور کا دروازہ بند کرنا اور لطف و کرم کا دروازہ کھولنا۔
(۳) عیش کا دروازہ بند کرنا اور زہد و ریاضت کا دروازہ کھولنا۔
(۴) تالیف قلوب کا دروازہ بند کرنا اور عدل کا دروازہ کھولنا
(۵) "ہرزہ و ہذیان" کا دروازہ بند کرنا اور علم و حکمت کا دروازہ کھولنا۔
(۶) حب جاہ کا دروازہ بند کرنا اور قناعت کا دروازہ کھولنا۔
(۷) جھوٹ کا دروازہ بند کرنا اور سچ کا دروازہ کھولنا۔

ان حلقوں میں دہریئے، نجومی، قصائی، جراح، محصل، شکاری اور سود خوار
داخل نہیں کئے جاتے تھے۔ ہر شخص کی قدر صرف ذاتی قابلیت کے لحاظ سے

ہوتی تھی اگر کسی کو اپنے نسب پر ناز ہو تو وہ اس دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کا قول تھا "خواہ انسان پیغمبر کا بیٹا کیوں نہ ہو اگر وہ جوہر ذاتی نہیں رکھتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔"

ظاہر ہے کہ ان اصولوں سے حقیقی جمہوریت ظاہر ہوتی ہے ہمارے زمانے کی جمہوریت نہیں جس نے محونا نہ مقابلے، خود غرضی اور انفرادیت کا بازار گرم کر رکھا ہے بلکہ وہ جمہوریت جس کی بنیاد قناعت پر تھی اور جس کا مقصد دولت کی مناسب تقسیم اور جماعت کی فلاح و بہبود تھی۔ ان حلقوں کی تعلیم سے اسے خدمت خلق کے جوش اور اخلاقی اصلاح کے جذبے سے معمور رہتے۔

سب سے قدیم فتوت نامے کا مصنف یحییٰ بن خلیل اپنی کتاب (فتوت نامہ نمبر ۱۰ ۹ کتب خانہ فاتح) میں کہتا ہے۔

"میں لڑکپن میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ اخیلر کے حلقے تنزل کی حالت میں ہیں اور انھیں ہدایت کی ضرورت ہے خداوند تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ۔ ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے"۔ میں نے دیکھا کہ اہل فتوت کو انھیں کی زبان میں تعلیم دینی چاہیے۔ اس لئے میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا بڑی بڑی کتابیں پڑھیں۔ اور یہ کتاب لکھ دی۔" جب عثمانی سلطنت کی قوت بڑھ گئی اور اس نے مرکزیت اختیار کر لی تو ان تمام برادریوں کو حکومت نے اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لیا۔

عثمانی عہد | عثمانی عہد میں ترکی سرکاری زبان ہوگئی اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس نے پوری پوری ترقی کی سلجوقی عہد کے خاتمے پر ترکی کی حیثیت باوجود اس کے کہ اس میں معرکے کی کتابیں موجود تھیں، وہی تھی جو چاسر کے زمانے میں انگریزی کی تھی اب اس نے عہد شیکسپیر کی انگریزی کی شان اختیار کر لی اس میں وہ لوچ اور نئے پیدا ہوگئی جو کسی اور ترکی بولی میں نہ تھی۔ غالباً مختلف نسلوں کی آمیزش سے نئے حروف علت زبان میں شامل ہو گئے اور "ک"، "گ" کی کرخت آوازیں قریب قریب ترک کر دی گئیں۔ غیر زبانوں سے جو الفاظ اختیار کئے گئے وہ ترکی کے سانچے میں ڈھل گئے ان کی تصریف ترکی کے قاعدے سے ہونے لگی اور وہ مخصوص معنی میں استعمال کئے جانے لگے۔ عوام کی زبان پر اس طرح کے بہت سے الفاظ چڑھ گئے۔

عثمانی امرا اور حکام کے طبقے کی تحریروں کا رنگ کچھ اور ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ کی بھرمار ہے اور ان کے معنی اور تصریف کے قواعد وہی ہیں جو ان زبانوں میں تھے ان کے اسما اور افعال بجنسہ استعمال ہوتے ہیں اور پھر اس کثرت سے کہ عبارت میں تکلف اور اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود رہا۔

عثمانیوں کے ادب کی تین قسمیں کی جا سکتی ہیں:۔

۱۔ سوانح نگاری | میرے خیال میں عثمانی ترکوں کے ادب کی بہترین صنف سوانح نگاری

ہے۔ پندرھویں صدی سے درباری مورخ برابر ترکی تاریخ قلمبند کرتے رہے۔
گو ان کی زبان خصوصاً سولھویں صدی کے بعد سے ثقیل ہے مگر ان میں حقیقت پسندی
اور واقعہ نگاری کا وصف ایسا ہے کہ ان کی تصانیف تاریخ کے طالب علم اور
آرٹ کے قدردان دونوں کے لئے بہت بڑی قیمت رکھتی ہیں۔ وہ اس زمانے
کی زندگی کا ہو بہو مرقع دکھاتے ہیں جس میں سلاطین، وزرا، امرا اور عوام سب
کی تصویریں موجود ہیں۔ زمانہ انقلاب میں عوام کی جد و جہد کا جیسا مفصل اور مکمل
بیان ان سوانح میں ہے میں نے آج تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ تنقید کا ان
کے یہاں نام بھی نہیں ہے خوش قسمتی سے یہ مورخ اور اس زمانے کے عثمانی اس
احساس کمتری سے پاک تھے جس نے ہمارے ادب اور خیالات پر جھوٹ کا رنگ
چڑھا دیا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھ دیتے تھے۔ انھیں اس کی فکر نہیں تھی
کہ دوسرے ملکوں کے لوگ کیا کہیں گے۔

صرف دو ترکی مورخوں کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے اور وہ بھی
پورا نہیں ان میں سے ایک اولیا ہے جو مورخ کے علاوہ سیاح بھی تھا اور
جس کا تخیل نہایت بلند پرواز ہے اور دوسرا نعیمہ۔

۲۔ ادب عالیہ:

عثمانی ادب میں قصیدے غزل اور مرثیے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
ان کے لکھنے والے "صاحب دیوان" کہلاتے ہیں۔ غزل اور مرثے میں تو ترکی

شعرا بعض اوقات اہل فارس کو جن کے وہ مقلد ہیں، مات کر دیتے ہیں مگر قصیدے میں وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کا موضوع سخن یا تو گل و بلبل، بہار و گلشن ہے یا جنگ و جدل یا سلاطین اور وزرا کی مدح۔ البتہ گھوڑے کی تعریف یا لڑائی کے ذکر میں کبھی کبھی ان کی طبیعت جولانی دکھا جاتی ہے۔ اور وہ اعلیٰ درجے کے شعر کہہ جاتے ہیں۔ باقی نے جسے اس عہد کے شعرا کی صف اول میں جگہ دی جاتی ہے سلیمان اعظم کی مدح میں بڑے معرکے کا قصیدہ کہا ہے جس میں اس کا مرثیہ بھی ہے۔ اور قصیدے تو شائد ہی کبھی پڑھے جاتے ہوں مگر یہ اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

"جب تیرا سمند ارجمند کہیں قدم رکھتا ہے، تو بڑے بڑے سردار دور دور سے امڈے چلے آتے ہیں کہ اپنی جانیں تجھ پر نثار کر دیں۔ روئے زمین اس سرے سے اس سرے تک تیرے آہن پوش سورماؤں کی جولانگاہ ہے جن کی شجاعت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔"

شہنشاہیت کی کیا اچھی تصویر ہے!

متصوفانہ شاعری | عثمانی دور کے دو سب سے بڑے شاعر سلسلہ مولویہ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے ایک جس کا نام سلیمان دیدی ہے، پندرھویں صدی میں گزرا ہے وہ بروصہ کی جامع مسجد کا امام تھا اور وہیں درس بھی دیا کرتا تھا۔ لوگ اس سے محبت رکھتے تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کا شاہکار

"میلاد نامہ" ہے جو ترکی زبان کی سب سے اچھی نظم سمجھی جاتی ہے میلاد نامے اور لوگوں نے بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہ مقبولیت کسی کو نہیں ہوئی سلیمان ویدی کا میلاد نامہ آج تک ہر مسلمان کے گھر میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ حضرات بھی جو مذہب کی قید سے آزاد ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور مغربی رعونت کے نشے میں چور ہیں، ان محفلوں میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ وہ حصہ جس میں ولادت کا ذکر ہے سہل اور سلیس ترکی زبان کا بے مثل نمونہ ہے شاعر آنحضرت کی والدہ محترمہ کی زبان سے کہتا ہے۔

"میں نے ایک نور دیکھا جس کا مہر عالم تاب پروانہ تھا۔ یہ میرے گھر سے بجلی کی طرح چمک کر آسمان پر پھیل گیا اور اس نے دنیا کو روشن کر دیا آسمان سے فرشتوں کے پرے کے پرے اتر کر آئے اور انھوں نے میرے گھر کو حلقے میں لے لیا۔ افلاک کے دروازے کھل گئے۔ اور ظلمت کا فور ہو گئی"

غرض اس رات جب زمین سے آسمان تک نور ہی نور تھا ساری کائنات جشن ولادت منا رہی تھی۔ وحش و طیر، جن و انس، رحمۃ للعالمین کے ظہور کی خوشی میں مست تھے۔

"کائنات میں مسرت و شادمانی کا دور دورہ تھا دنیا کے سر سے غم و الم کا بوجھ اُتر گیا تھا اور اس کی رگوں میں نئی زندگی کا لہو دوڑ۔ ہا ننھا ذرے ذرے سے مرحبا کی آواز آ رہی تھی!

"مرحبا! اے جان اصفیا، مرحبا!

"مرحبا! اے فخر اولیا، مرحبا!

"عاصیاں کے شفیع، مرحبا! مرحبا!

"بیکسوں کے کفیل، مرحبا! مرحبا!"

اس کے بعد صوفی شعرا میں غالب دوہ گذرا ہے جس پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کا زمانۂ حیات اٹھارویں صدی کے آخر سے انیسوی صدی کے شروع تک تھا۔ وہ حسن و عشق کا شاعر تھا اور اس کا موضوع سخن اکثر لیلیٰ مجنوں کا افسانہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی عظیم الشان شخصیت ترکی ادب میں زندہ جاوید کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کبھی فٹزجیرالڈ کے پائے کے کسی مغربی شاعر نے اس کے کلام کا ترجمہ کر دیا تو اسے دنیا میں عمر خیام سے کم مقبولیت حاصل نہ ہوگی

<u>فطرت پسندانہ شاعری</u>! اٹھارویں صدی کے آخر میں ایک طرف ملک میں سیاسی تنزل کا دور دورہ تھا مگر دوسری طرف حسن ذوق اور حسن معاشرت معراج کو پہنچ چکا تھا۔ شاعری میں لوگ مذہبی نظموں سے اور ان قصیدوں سے جن میں سلاطین کی تعریف کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا اُکتا گئے تھے۔ ترکوں کو واقعی زندگی سے دلچسپی اور اس کی سچی تصویر کھینچنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کی ابتدا میں فطرت پسندانہ شاعری کی بنیاد پڑی۔ اگرچہ اس حلقے کے سب شاعر اوسط درجے کے تھے مگر انھوں نے وہ کام کیا جو کسی اور عہد کے شاعر

نہیں کر پائے تھے یعنی اپنے زمانے کی ترکی معاشرت کا ہو بہو نقشہ اپنے کلام میں کھینچ دیا۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا آئینہ بنا دیا اور انسانی فطرت کی مصوری کا حق ادا کر دیا۔

میں وصاف اندرونی کی ایک نظم کے بعض حصے نقل کرتی ہوں جس میں ایک ماں اپنی بیٹی کو نصیحت کرتی ہے اور بیٹی اس کا جواب دیتی ہے۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ اس زبان میں لکھی گئی ہے جس میں استنبول کی عورتیں بات چیت کرتی ہیں۔ اس میں عرب طبقے کی ایک بوڑھی اور ایک جوان عورت کی سیرت دکھائی گئی ہے اور یہ اپنے موضوع اور طرز بیان کی وجہ سے بوڑھوں اور جوانوں کی ان بن کی ایک ابدی مثال ہے جو ہر قوم اور ہر زمانے پر صادق آتی ہے۔

"سن لڑکی تو بیٹھی اور سیدھی بن۔ بناوٹ کی حیا اور بے شرمی دونوں سے پرہیز کر۔ اپنے لہنگے کو کیچڑ میں گھسیٹتی نہ پھر گلیوں کی جھاڑو نہ بن۔ عورتوں کے ڈھنگ سیکھ۔ ارے کمبخت لگاوٹ کی باتیں نہ کیا کر۔ رنگیلوں چھبیلوں کے پیچھے نہ پھرا کر سیپے کھیلے میں نہ جایا کر۔ سینا پرونا کشیدہ کاڑھنا سیکھ۔

' اری بیٹی تو میرے کان کیوں کھائے جاتی ہے ناچنے والیوں کی طرح ٹھمکتی پھر رہی ہے تجھے شرم نہیں آتی بے حیا کہیں کی۔ یہ مارا مارا پھرنا کیسا؟ یہ چلمن کی آڑ سے مردوں سے چہلیں کیوں؟ اری اب تو چودھویں سال میں ہے

اب تو ناچنا گانا چھوڑ۔ یہ تو نے سر میں چمک دار پٹی کیوں باندھ رکھی ہے، اس لئے کہ موئے نکمے شرابی دیکھ کر ریجھ جائیں؟

"تیری بڑی بہن کا بیاہ ہو گیا ہے۔ کہیں جا تو اس کے ساتھ جایا کر اب تو بچہ نہیں ہے ڈھنگنی ہے تو کیا ہوا۔ دیکھ عفیفہ کی شادی کیسی اچھی جگہ ہو گئی۔ اللہ تجھے بھی ایسی قسمت دے۔ کاش تیرا باپ تیری شادی کسی قاضی سے کرے جس کا مکان سمندر کے کنارے ہو تاکہ ہم تیرے یہاں آتے جاتے رہیں اب عورتیں تجھے دیکھنے کو آنے لگی ہیں کیا تعجب ہے کہ وہ بڑھیا آج پیام لے کر آئے۔ جا زیور پہن لے۔ گلے میں حمائل ڈال لے۔

"اری ناشدنی ضدن لڑکی تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو غصہ میں اینٹھی جاتی ہے اور مجھے گالیاں دے رہی ہے۔ ہائے میں نے اسی دن کے لئے تجھے ان مصیبتوں سے پالا تھا۔ اری گلیوں کی جھاڑو نہ بن عورتوں کے ڈھنگ سیکھ"

اب سو سال پہلے کی لڑکی کا جواب سنئے۔ پہلے وہ دل ہی دل میں بگڑتی ہے "اب کی بار ماں نے نصیحت شروع کی تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی میں کسی کی دبیل نہیں جو میرا جی چاہے گا وہ کروں گی جب یہ جوان تھی تو کیا سدا گھر میں منھی رہتی تھی۔ ہماری پڑوسنوں کو دیکھو مزے سے گاڑی میں بیٹھ کر سیر کرتی پھرتی ہیں"

پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

"ماں یہ تمہارا چرخا کب تک چلے گا جاؤ تم بیٹھ کر اپنا سوت کاتو۔ تم مجھ سے نہ کہا کرو کہ تیرا میاں فلانا ہوگا ڈھمکا ہوگا۔ چولھے میں جائے میاں اور بھاڑ میں جاؤ تم چاہے مجھے گھر کا ایک ایک برتن بیچنا پڑے مگر میں تو ایک پندرہ برس کا دولھا ڈھونڈ کر لاؤں گی اور اس سے بیاہ رچاؤں گی۔"

پھر چپکے چپکے کہتی ہے۔

"باورچی خانے کے برتن دھوتے دھوتے میرے ہاتھ خراب ہوئے جاتے ہیں۔ ماں مجھ سے کھانا پکواتی ہے اور اپنے دوستوں کو کھلاتی ہے۔ اللہ کرے باپ اس کا سر پھاڑ دے۔ اس نے تو مجھے لونڈی بنا رکھا ہے۔ میں اپنے گورے گورے نرم نرم ہاتھ کیسے خراب کر لوں یہ تو ریشم بننے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

"جاڑے اور گرمیاں گذری چلی جاتی ہیں اور ماں یہ چاہتی ہے کہ میں گھر میں بیٹھی رہوں۔ اگر یہی حال رہا تو بن عقل ڈاڑھ نکلنے سے پہلے ہی بوڑھی ہو جاؤں گی میں تو ایک پندرہ برس کا دولھا ڈھونڈھ کر لاؤں گی اور اس سے بیاہ رچاؤں گی۔"

"آؤ اسماخانم میرے منھ پہ غازہ مل دو، میرے بال سنوار دو، ہر ایک میری شکل کی تعریف کرتا ہے لاؤ ذرا آئینہ میں دیکھ لوں سب ٹھیک ہے میں طوطی خانم کا لال پاجامہ مانگ لوں گی، اس کی زرد شال اپنی نازک کمر میں لپیٹ لوں گی، اپنے بالوں میں چمکدار پٹیاں باندھ لوں گی اور بن سنور کر اٹھلاتی ہوئی گاڑی میں سیر

کروں گی۔ بڑھیا سی پنکھی ہاتھ میں لے کر حجرے میں بیٹھوں گی۔ باپ کو تو میں دم بھر میں راضی کر لیتی ہوں بس ان گوری گوری انگلیوں سے ڈاڑھی سہلانے کی دیر ہے۔

• مجھے یہ موچھوں والے سنڈے پسند نہیں۔ اگر میرے میاں نے میری بات نہ مانی وہ لات دوں گی کہ سیدھا کنوئیں میں جا کر گرے۔ مجھے تو ٹھکنڈرے لڑکے پسند ہیں جن کے سر پر ترچھی ٹوپی ہو۔ میں تو پندرہ برس کا دولہا ڈھونڈ کر لاؤں گی اور اس سے بیاہ رچاؤں گی۔"

عہد تنظیمات | آرٹ کے نقطہ نظر سے یہ افسوس کی بات ہے کہ یہ فطرت پسند اتہ شاعری بہت جلد ختم ہو گئی۔ مگر اس کی جگہ جس شاعری نے رواج پایا اُس نے باوجود اس کے کہ وہ خیالات اور طرز ادا کے لحاظ سے فرانسیسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی عثمانی ترکوں کے عہد میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔

اگرچہ عہد تنظیمات کی تصنیفات کا اسلوب بیان اور موضوع کلام بالکل بدلا ہوا ہے مگر ایک چیز ان میں اور عہد ابتدائی کی تصانیف میں مشترک ہے۔ اس عہد کے لوگوں نے بھی تیرھویں صدی کے صوفیوں کی طرح ادب سے خیالات کی اشاعت کا کام لیا۔ البتہ ان سے پہلے ترکی مصنفوں کے خیالات مذہب کے دائرے کے اندر محدود تھے اس معاملے میں ان پر قرون وسطیٰ کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ تنظیمات والوں نے اس دائرے سے باہر قدم رکھا اور غیر مذہبی مسائل پر اپنے سوچے ہوئے یا دوسروں سے اخذ کئے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگے۔

ڈاکٹر عدنان نے اپنی غیر مطبوعہ "تاریخ علم و مذہب" میں عہد تنظیمات کے ادب کو قرون وسطیٰ اور زمانہ حال کے بیچ کی کڑی قرار دیا ہے۔

شناسی ۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۱ء تنظیمات کے ادب کا بانی شناسی تھا جو نوجوان ترکوں کا سیاسی لیڈر بھی تھا۔ سولہ برس کی عمر میں وہ سلاح خانے میں معمولی محرر تھا اسے عربی اور فارسی ادب پر پورا عبور حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے اس عمر میں پوری ترکی لغت زبانی یاد تھی۔ یہ بات کسی اور کے متعلق کہی جائے تو مہمل معلوم ہو گی۔ مگر اُس کی صورت دوسری تھی۔ اُس نے ہر ترکی لفظ کا سمی نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کا پتہ لگایا تھا کہ وہ نشو ونما کی کن کن منازل سے گذرا ہے اور ترکی زبان کی کتابوں میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سلاح خانے میں اس کی دوستی ایک فوجی افسر سے ہو گئی جو اصل میں ایک فرانسیسی امیر تھا اور جس نے مذہب اسلام قبول کر کے ایک ترکی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس سے شناسی نے ترکی زبان سیکھی اور فلسفہ اور سائنس کی نئی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ وزیر اعظم مصطفےٰ رشید پاشا اور نوجوان روشن خیال سلطان عبد المجید دونوں اُسے نظر التفات سے دیکھنے لگے وہ پیرس بھیج دیا گیا کہ مالیات میں مہارت حاصل کرے۔

پیرس میں آکر ابتدا میں چند سال تک وہ فلسفہ اور سائنس کی تحصیل کرتا رہا مگر اپنی فرصت کا سارا وقت وہ ادب کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا کسی قوم کی تاریخ میں ایسے لوگوں کی مثالیں کم ہوں گی جو اتنی زبردست محنت کر سکتے ہوں۔ اس کے

ذوق، علم، سادگی، وقار و متانت اور انتہائی زہد کی وجہ سے فرانس کے ارباب علم کی نظر میں اس پر پڑنے لگیں اس سے لامارٹین لیتر (فرانسیسی انسائکلوپیڈیا کے مصنف) اور ارنسٹ ریناں سے گہری دوستی ہو گئی۔

پیرس سے واپس آنے کے بعد وہ نئی ترکی اکادمی کا رکن، اور مجلس مالیات کا رکن مقرر کیا گیا۔ وہ فوج کی مالیات کی نگرانی کرتا تھا۔ شیخ جمال الدین افغانی سے جو ان دنوں ترکی میں تھے اس کی بڑی دوستی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد وزیر اعظم ہو جائے گا مگر وہ بہت اکھڑ آدمی تھا اور اس کی صاف گوئی سے سلطان اور اعیان سلطنت ناراض رہتے تھے۔ وہ سلطان عبدالمجید کے خلاف ایک سازش میں بھی شریک تھا۔ مگر سلطان فرشتہ صفت آدمی تھا، اس نے ورگذر سے کام لیا۔ عبدالمجید کی وفات کے بعد وہ استبدادی حکومت کی بدستور مخالفت کرتا رہا۔ اس نے نئے وزیر اعظم علی پاشا کا جو نوجوان ترکوں کی آئینی تحریک کا دشمن تھا، خوب خاکہ اڑایا۔ علی پاشا نے اسے سب عہدوں سے موقوف کر دیا اور بہت ذلیل کیا۔ اس کے ہمعصر اس کو جمہوریت پسند اور دہریہ سمجھتے تھے۔

ان ناکامیوں کے باوجود شناسی کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوئی اس نے اخبار نویسی اختیار کی اور ترکی میں جدید طرز کے اخبار کی بنیاد ڈالی۔ اب تک صرف سرکاری اخبار ہوا کرتے تھے۔ اس نے پہلے "ترجمان" اور اس کے بعد "تصویر افکار" نکالا تصویر افکار کا جدید ترکی کے خیالات کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ

ہے۔ طباعت کے فن کو رواج دینا، بڑے پیمانے پر کتابوں کی اشاعت کرنا رائے عامہ کی تربیت کرنا یہ سب اسی ایک شخص کے کارنامے ہیں۔ یہ اخبار سوائے سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت کے ہر زمانے میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۵ء میں بالکل بند کر دیا گیا۔

جب تصویر افکار" کا پہلا نمبر شائع ہوا تو سلطان عبدالعزیز نے اظہار خوشنودی کے طور پر اُسے پانسو پونڈ بھیجے اس نے اس کڑے جواب سے ساتھ واپس کر دئے "مجھے پانسو پونڈ کی کوئی چیز خریدنے کی ضرورت نہیں ہے"

جب اس کے ساتھیوں پر سختیاں ہونے لگیں اور اس پر بھی مقدمے قائم کئے گئے تو وہ پیرس چلا گیا اور زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھی ترکی آجاتا تھا۔ مرنے سے چند سال پہلے وہ استنبول آگیا۔ اپنے دارالاشاعت میں رہتا تھا اور جس انتہائی سرگرمی سے تمام عمر کام کرتا رہا، اسی طرح اب بھی کرتا تھا۔ آخر وہ دماغی بخار میں مبتلا ہو گیا جس سے جانبر نہ ہو سکا۔

اس کی سب سے عزیز تصنیف عظیم الشان ترکی لغت تھی جو وہ ہزار ہزار صفحے کی چودہ جلدوں میں لکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اکتیس حرفوں میں سے صرف بیسویں حرف تک لکھ پایا تھا اس نے ہر ترکی لفظ کا ماخذ بتایا ہے اور اس کا استعمال ترکی ادب میں اول سے آخر تک دکھایا ہے۔ اس لغت کے مسودے کا کچھ حصہ پیرس میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے اور کچھ بوڈا پسٹ

یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے اس کے اخباریں کارنئے ما راسین، لافونتائن اور فینیلون کتابوں کے اچھے اچھے ترجمے شائع ہوئے۔ اُسے جانوروں سے بہت شوق تھا اور علم مو الیدمیں خاصا دخل تھا۔ اس نے جانوروں کے کئی قصے نظم کئے ہیں (گدھا۔ لومڑی۔ عقاب۔ مچھر۔ شہد کی مکھی)۔ اگرچہ ترکی کے ادب العوام میں جانوروں کے قصے بہت کثرت سے ہیں مگر مستند مصنفین میں شناسی کے سوا کسی نے آج تک اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا اُس نے ایک فرحیہ منظوم شاعر کی شادی، کے نام سے لکھا ہے جس میں پرانے زمانے کے اور خود اپنے عہد کے شاعروں کا خاکہ اُڑایا ہے۔ اس کی تحریروں کا بڑا حصہ تصویر افکار کے مجموعوں میں محفوظ ہے۔ ترکی کی ذہنی ترقی کے اس علم بردار کی زندگی جس سختی اور بے لطفی سے گذرتی تھی اس کے متعلق اس عہد کے نصیحت گر اور طنز نگار شاعر ضیا پاشا نے خوب کہا ہے "وہ بدقسمت ہے وہ شخص جسے اپنے علم اور نیکی کا پھل اس کے سوا کچھ نہ ملے کہ اُسے جاہلوں کے ہاتھ سے ظلم سہنا پڑے"۔

نامق کمال۔ اس کے بعد ادب اور ریاست دونوں کی رہنمائی کا منصب نامق کمال کو حاصل ہوا۔

وہ ایک سرکاری عہدہ دار کا بیٹا تھا جسے سلطنت کے مختلف حصوں میں رہنا پڑا۔ نامق کی ابتدائی تعلیم بالکل قدیم ترکی طرز پر ہوئی تھی اُسے نوعمری میں شناسی کی صحبت نصیب ہوئی اور وہ اس کا معتقد اور پیرو ہوگیا۔

شناسی نے ادب کے نئے حلقے کی بنا ڈالی تھی مگر اس میں اور نامق میں یہ فرق ہے کہ وہ ہموار طبیعت کا علمی اور عقلی آدمی تھا اور نامق رومانی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا جن خیالات کو شناسی نے سنجیدگی اور سادگی سے ادا کیا ہے، نامق کمال نے اُن کے ظاہر کرنے میں انتہائی جوش و خروش سے کام لیا ہے۔ غرض نئے ادب میں جذبات کا انتہائی زور نامق کمال ہی نے پیدا کیا ہے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ وہ محض نقّال نہیں تھے بلکہ نقالوں کی اُسی طرح خبر لیتے تھے جیسے پرانے دور کے لوگ انھوں نے ترکی ادب کی ایک نئی راہ نکالنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

نامق کمال کے کارنامے شناسی کے کارناموں سے کسی طرح کم نہیں۔ ممکن ہے شناسی دہریہ اور جمہوریت پسند ہو، مگر نامق یقیناً پکا مسلمان اور سلطنت کا وفادار تھا۔ البتہ وہ دستوری حکومت چاہتا تھا۔ وہ اپنے مذہب اور تمدّن سے محبت رکھتا تھا اور علم و حکمت اور فنون لطیفہ کے ان خزانوں کی دل سے قدر کرتا تھا جو ترکی قوم نے صدیوں میں جمع کئے تھے۔

تصانیف | اس کے ترجمے اور تصانیف دونوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ اسے سائنس سے زیادہ تاریخ سے دلچسپی تھی، اگرچہ وہ فرانسیس بیکن کی کتابوں کا مطالعہ بہت شوق سے کیا کرتا تھا۔ اس نے مونتیسکیو۔ کوندورسے، روسو کی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا تھا۔

اس کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور " دیباچہ تاریخ عثمانی"، عہد فتوحات" ترکی ادب کی تنقیدی تاریخ (جو ویرانوں کی سیر کے نام سے موسوم ہے) اور متعدد ناولیں، نظمیں اور ناٹک ہیں۔ نئے ادب کے ہر میدان میں اس نے ہراول کا کام کیا ہے۔ اس نے دو اصولوں کو جو انیسویں صدی کے وسط میں مغرب میں مقبول ہو چکے تھے ترکی رنگ میں رنگ کر اس شدو مد سے اختیار کیا کہ انھیں مذہبی عقائد بنا لیا ان میں سے ایک تو حب وطن کا اصول تھا اور دوسرا حقوق انسانی کا۔

حب وطن | حب وطن اس معنی میں جو آج کل سمجھے جاتے ہیں، اس کا خاص موضوع ہے۔ اس نے جا بجا اپنے ملک کے حال زار کا دل دوز مرقع دکھایا ہے۔ خصوصاً ایک نثر کی کتاب میں جس کا نام " خواب" ہے اور ایک اور نظم میں جس کا عنوان " واویلا" ہے۔ اس نے ان خیالات کے اظہار میں انتہائی جوش و خروش سے کام لیا ہے۔

"خواب" میں اسے مادر وطن کی تصویر یہ نظر آئی کہ ایک عظیم الشان ہستی زخموں سے چور کفن میں لپٹی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ وہ درد سے بیتاب ہے مگر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے " واویلا" میں وہ مادر وطن سے التجا کرتا ہے کہ اپنے سفید کفن پر سیاہ چادر ڈال لے، ایک ہاتھ کربلا کی طرف اور دوسرا روضہ رسول کی طرف پھیلا کر کھڑی ہو جائے اور بارگاہ الٰہی میں ان لڑائیوں کی فریاد کرے جو ترکی کی زمین پر لڑی گئیں اور جن میں سے ایک ایک لڑائی بدر و حنین کے معرکے سے

کم نہ تھی ۔اس نے یہ دکھایا ہے کہ سلطنت کی تاریخ میں ترکوں کا خون کس کس طرح سے بہایا گیا اور کن کن شہیدوں نے اپنے وطن کی زمین کو اپنے خون سے سینچا۔ یہ استعارہ اب بہت پامال ہو چکا ہے مگر اُس زمانے میں نیا تھا۔اور نامق کمال نے اپنے شدت جذبات سے اس میں جان ڈال دی ۔اس موضوع پر اُس نے ایک ناٹک "وطن" کے نام سے لکھا۔جب یہ اسٹیج پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں میں اس قدر جوش پیدا ہو گیا کہ وہ اپنے قابو میں نہ رہے ۔ تماشا ختم ہونے کے بعد لوگوں نے ایک جلوس نکالا اور تمام رات مشعلیں ہاتھ میں لئے استنبول کی تاریک گلیوں میں گشت لگاتے رہے ۔ دوسرے دن نامق کمال گرفتار ہو گیا ۔ اور کچھ دن کے بعد جلاوطن کر دیا گیا۔

حقوق انسانی | دوسری چیز جس کی نامق کمال نے اسی زور شور سے حمایت کی حقوق انسانی کا نظریہ تھا ۔اس کو اس نے مذہبی رنگ سے الگ رکھا۔ ابراہیم لنکن کا قول ہے "کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے پر بغیر اس کی مرضی کے حکومت کرے" نامق کمال نے یہ ثابت کیا کہ جس حکومت کی بنا محکوموں کی رضامندی پر نہ ہو وہ لازمی طور پر استبدادی حکومت بن جاتی ہے اور ہر شخص کو چاہیئے کہ حقوق انسانی کی حفاظت کے لئے لڑے اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے ۔

اگرچہ تاریخ کے ہر عہد کے خیالات اور نظریات مختلف ہوتے ہیں اور آج کل فرد کے حقوق کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے تاہم جو تعلیم نامق کمال نے دی

تھی اس کی حقیقت اور عظمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اُس کی تعلیم کا اصل نکتہ یہ تھا کہ انسان کو لازم ہے کہ عقیدے کی خاطر قربانی کرے، ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھائے، یہاں تک کہ اگر ضرورت ہو تو اُس کی راہ میں شہید ہو جائے۔ اگر مذہب سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ نظریہ کہ سب انسان برابر ہیں، مشرق میں ایک نئی چیز تھی۔ اس نے اس خیال کو اپنے ایک شاہکار میں جو "قصیدہ حریت" کے نام سے موسوم ہے، ظاہر کیا ہے۔ اس میں نہ تو وہ تغزل کا رنگ ہے اور نہ تشبیہ و استعارے کا وہ اہتمام جو اُس کی اور نظموں میں پایا جاتا ہے۔ اس میں اس نے متانت اور وقار کی شان سے اپنے اس عقیدے کا اظہار کر دیا ہے جس کی وجہ سے اُس نے عمر بھر تکلیفیں اُٹھائیں مگر یہ گوارا نہ کیا کہ جاہ و منصب کی خاطر امرا و اکابر کی خوشامد کرے۔ وہ اور شناسی دونوں اگر اپنے عقیدے میں اس قدر سخت نہ ہوتے تو ضرور وزیر اعظم ہو جاتے۔ میں اس قصیدے کا خلاصہ چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔

"یہ دیکھ کر کہ زمانہ کی روش حق اور ایمان سے منحرف ہو گئی ہے ہم نے عزت اور عظمت کے ساتھ منصب حکومت سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ وہ انسان جو انسانیت کے لقب کا مستحق ہے کبھی خلق خدا کی خدمت سے نہیں تھکتا۔ وہ ہمیشہ ستم کشوں اور مظلوموں کی دستگیری کرتا ہے۔ ظالموں کا حامی وہی ہوتا ہے جس کا دل و دماغ شقاوت سے معمور ہو۔ کتوں کو اسی میں مزہ آتا ہے کہ خونخوار شکاری کے آگے آگے

دوڑیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ لوگ کہیں یہ وہ شخص ہے جو اپنے مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے کو وزیر کے منصب بلکہ وزیر اعظم کے مرتبے سے زیادہ عزت اور مسرت کا باعث سمجھتا ہے۔

"پھانسی کی رسی جو موت کا اژدہا ہے، اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں انسان کو غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑے۔ خواہ آزادی کا میدان جہنم کا طبقہ ہو انسان اُسے چھوڑنا گوارا نہ کرے گا تقدیر کے پاس ظلم و جور کے جتنے ہتھیار ہیں وہ لے کر آجائے اور مجھ پر حملہ کرے اگر میں خدمت کی راہ اور جنگ کے میدان سے ہٹ جاؤں تو مجھ سے بڑھ کر بزدل دنیا میں کوئی نہ ہوگا آہ اے آزادی، تجھ میں کیا جادو ہے کہ ہم نے سب زنجیروں کو توڑ پھینکا مگر تیری غلامی کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا!"

نامق کمال کی زندگی سراسر شہادت تھی۔ کبھی وہ قید کی مصیبت جھیلتا رہا کبھی جلاوطنی کی صعوبت اٹھاتا رہا مگر اس کی ہمت و شجاعت اس کی آن بان اور تیور میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اس نے جلاوطنی کی حالت میں ایک جزیرے میں وفات پائی اور بولئیر کے مقام پر دفن ہوا۔

عہد تنظیمات میں یا اس سے پہلے جتنے مصنفوں نے کسی مقصد کو نظر میں رکھ کر قلم اُٹھایا، اُن میں سے کسی کو نامق کمال کے برابر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ عبدالحمید کے عہد سلطنت میں پچاس برس تک ہزار ہا نوجوان اس جرم میں معتوب ہوئے اور

مارے گئے کہ وہ چھپ چھپ کر اس کی کتابوں کا مطالعہ اور اُس کے خیالات کی اشاعت کرتے تھے۔ جہاز کے جہاز استنبول سے نوجوانوں کو، جن میں اکثر اسکول کے لڑکے ہوتے تھے، یمن اور طرابلس لے جا کر اُن صحراؤں میں چھوڑ دیتے تھے جہاں قدیم زمانے سے لوگ جلا وطن کر کے بھیجے جایا کرتے تھے۔

عبدالحق حمیدؔ اس حلقے میں اگر اپنی ذاتی صفات اور اپنی تعلیم کے لحاظ سے نہیں تو اپنے آرٹ کے لحاظ سے ضرور سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اُس کی زندگی کا بڑا حصّہ لندن میں گذرا جہاں وہ ترکی سفیر کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اس نے ترکی زبان میں ناٹک لکھے، جو ادب جدید کی مستند کتابوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ترکی کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ ہماری روحانی شاعری کا اس پر خاتمہ ہوگیا۔ اس کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کر دیا اور اگر اُن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو جائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی شہرت حاصل کر لیں۔ اس کی کتابوں میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا گیا ہے۔ گو اِن میں پرانے زمانے کے قصّے ہیں مگر اس نے جا بجا سلطان عبدالحمید کے استبداد پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔ اس کے نزدیک ظلم و جور، زمانے کے تغیرات سے بے خبری، تعلیم کی کمی، سرکاری ملازمتوں کا کوئی باضابطہ محکمہ ہونا، حاکم و محکوم میں باہمی اتحاد و اعتبار نہ رہنا۔ یہ سب ملک کے زوال اور تباہی کی علامتیں ہیں۔

میں اس کی ایک چھوٹی سی عبارت کا آزاد ترجمہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔
یہ وہ موقع ہے جب طارق ابن زیاد فاتح ہسپانیہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے

"اے طارق آج تو شاہان ہسپانیہ کے خزانے میں کھڑا ہے۔ دیکھ تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا شام سے طلیطلہ میں، غریبوں کی جھونپڑی سے شاہوں کے خزانے میں۔ مگر یاد رکھ ایک دن تجھے قبر میں بھی جانا ہے۔ ذرا بادشاہوں کے تاج دیکھ کر اور انہیں ہاتھ میں لے کر تیرے ہاتھ میں یہ چمک دار چیزیں کیا ہیں جن پر نظر نہیں ٹھہرتی ہے بڑے بڑے بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے تاج یہ آج تیری مٹھی میں ہیں۔ گذری ہوئی عظمت اور شوکت کے پچیش گراہ۔ مگر خود تو کیا ہے اے فتحمند سپہ سالار؟ فقط قبروں کا محافظ۔

"خبردار ان تاجداروں کی تقلید نہ کرنا جو ان تاجوں کے مالک تھے۔ وہ نادان اور مغرور تھے وہ اللہ کی عظمت اور قدرت سے نہیں ڈرتے تھے۔ انھیں انسان کی عاجزی اور بیکسی کا علم نہیں تھا اور زمانے کا تغیر نظر نہیں آتا تھا۔

"آج تو ان کے شاندار محل میں کھڑا ہے، ان کی دولت کا مالک ہے۔ تو نے اُن کے گڑے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ لیا ہے۔

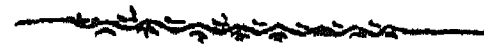
'تقدیر کے دھارے کا پلٹنا دیکھ۔ اس جلیل القدر قوم کا انجام دیکھ جو آج تیرے قدموں کے تلے ہے۔ یہ انقلاب تیرے ہی ہاتھوں ہوا ہے مگر پھر بھی اے طارق ابن زیاد تو کیا ہے محض ایک ذرہ بے مقدار۔

"پڑھ اے طارق ابن زیاد پڑھ ان میں سے ہر ایک تاج ایک بادشاہ کی

عبرت ناک داستان سناتا ہے۔ پڑھ اے ابن ناصر کے غلام!

"راڈرک نے اپنی قوم پر ظلم کیا۔ اتنا ظلم کیا کہ آج قوم کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ دانش منداس کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کے گرد خوشامدیوں کا حلقہ تھا اور اس کے ملک پر جاہلوں اور نااہلوں کی حکومت! اس شہر کی عمارتوں میں مجھے ایک مدرسہ، ایک ہسپتال بھی نظر نہیں آیا، جدھر دیکھئے محل ہیں یا قید خانے یا گرجے۔

"راڈرک کو خبر نہ تھی کہ جس ملک کا بادشاہ ظالم ہو جس کے باشندے جاہل اور بے بس ہوں اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ غیر قومیں اُسے کچل کر رکھ دیتی ہیں۔"



چھٹا خطبہ

ادب اور تہذیب (۲)

خواتین و حضرات!

عبد الحمید نے عہد تنظیمات کے ادب کو، جو خاص خیالات اور خاص نصب العین کا حامل تھا، ختم کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بظاہر وہ اس میں کامیاب ہوا یعنی ان کتابوں کی اشاعت بند ہو گئی اور وہ الفاظ جو ان خیالات کو ظاہر کرتے تھے لغت سے خارج کر دیئے گئے۔ ان کتابوں کا ایک صفحہ بھی چوری سے پڑھنا یا ممنوع الفاظ میں سے کسی لفظ کا زبان پر لانا بغاوت میں داخل تھا اور اکثر اس کی پاداش میں لوگ عمر بھر کے لئے جلاوطن کر دیئے جاتے تھے یعنی "دستور" "آزادی" "وطن" سرکاری اخباروں کے سوا اور کوئی اخبار نکلنے نہیں پاتا تھا اور ہر سطر کو چھپنے سے پہلے محتسب مطابع پڑھ لیا کرتا تھا۔ ان میں سرکاری ملازموں کی ترقی کی فہرست اور سلطان کی تعریف چھپا کرتی تھی یا اور ایسی چیزیں جن کی محتسب اجازت دے دیتا تھا۔

ادبیات جدیدہ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود عبدالحمید کے عہد میں ایک ادبی حلقے نے فروغ حاصل کیا۔ جب ہر قسم کے نئے خیالات ممنوع قرار دئے گئے تھے تو اُن مصنفوں سے یہی توقع ہو سکتی تھی کہ انیسویں صدی کی سیدھی سادی فطرت پسندی کی طرف رجوع کریں گے مگر یہ اس قسم کے لوگ نہ تھے۔ چونکہ وہ اپنے دلی خیالات کو دبانے پر مجبور کئے جاتے تھے اس لئے اُن کے خیالات میں عجیب عجیب گرہیں پڑ گئیں۔ پہلی گرہ مخالفت مذہب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو جدید تمدن سے روکنے والا مذہب اسلام ہے۔ دوسری مخالفت ماضی، اس لئے کہ وہ ماضی کو اپنا بہت بڑا دشمن سمجھتے تھے جو مشرق اور مغرب کے درمیان حائل تھا۔ تیسری مغرب پسندی تھی جس میں وہ حد سے بڑھے ہوئے تھے انھیں مغرب میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی تھیں مگر ان کے ذہن میں جو مغرب کا تصور تھا وہ صرف چند چیزوں تک محدود تھا۔ سائنس، عقلیت اور مادّیت۔

فنّی اور ظاہری خصوصیات یہ چیزیں کمال کو پہنچ گئی تھیں۔ ناول بالکل جدید طرز پر لکھے جاتے تھے اس کا سہرا خالد ضیا بے کے سر تھا جو اس حلقے کا جدید ناول نویس تھا۔ اس کے ناولوں کے موضوع ایک چھوٹے سے حلقے کی زندگی تک محدود تھے جس پر مغربیت کا رنگ حد سے زیادہ چڑھ چکا تھا۔ مگر اس کے شاہکار مختصر افسانے ہیں۔ ان کا موضوع حقیقی زندگی کا وسیع میدان تھا نہ کہ غیر ملکی نمونوں کی نقل در نقل۔ مجموعی طور پر اس حلقے کے مصنف مغرب کی اسی طرح ہو بہو

ہی پر قائم ہے۔ اس میں جتنا حصہ ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا ہے اس کو جتنا جی چاہے بُرا کہہ لیجئے مگر مجموعی حیثیت سے مذہب کی عزت اور احترام کرنا چاہئے اور اور اسی پر نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کی بنا رکھنی چاہئیے۔ اس کے اس طرح مذہب پر اندھا دھند حملہ کرنے سے بداعتقادی پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ لوگ اپنے ماضی سے قطعاً نفرت کرنے لگے۔

اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس نظم میں بڑے پاکیزہ اور پائدار خیالات ہیں جو پر زور انداز میں بیان کئے گئے ہیں یہاں توفیق فکرت جنگ وجدل کا مخالف، بین الاقوامی۔ اتحاد عمل کا علم بردار۔ عالمگیر برادری کا حامی اور عقل انسانی کی فضیلت اور خوبی کا دل سے معتقد نظر آتا ہے۔

نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ماضی کی روح مجسم ہوکر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچا ہے جس کے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہے اس کے آنے سے رات کی مدت بڑھ جاتی ہے اور صبح جس کی نوع انسانی منتظر ہے اور دور ہوجاتی ہے۔ تشدد کے خلاف اس سے زیادہ شدید حملہ شاید ہی کسی زبان کے ادب میں کیا گیا ہو۔

"ہماری آرزو ہے کہ صبح ہوجائے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے پہاڑ سی اندھیری راتیں خواب غفلت میں گذاری ہیں صبح کا سارک جلوہ دیکھنا نصیب ہو۔ اے مہیب پیکر جو اندھیرے میں قدم اُٹھائے چلا آرہا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے

خونخواری ٹپک رہی ہے .. تو ہی ہے جس نے میری قوم کو برباد کر دیا ہے۔

"کیا کہا؟ شجاعت؟ جس کی بنا خونریزی اور وحشت پر ہے۔ فتح؟ یعنی شہر کے شہر روند ڈالنا، فوجیں کی فوجیں کاٹ کر رکھ دینا، قتل و خون، گیر و دار، تباہی، بربادی، پامالی، آتش زنی، غارت گری۔ رحم کا نام نہیں آہوں اور آنسوؤں کا اثر نہیں۔ جہاں تیرا قدم پہنچا آفت آئی، مصیبت آئی۔ فصلیں برباد، گھاس اور کائی تک معدوم، خاندان تباہ ہو گئے۔ بستیاں اجڑ گئیں۔ ہر گھر قبر بنا دیا گیا، ہر چھت معصوم بچوں کے سر پر گرا دی گئی۔"

فکرت جس زندگی کا خواب دیکھتا ہے اس میں نہ سلطنت ہے نہ حکومت، نہ لوٹ نہ کھسوٹ، نہ ظلم نہ زیادتی۔ تم اپنے گھر خوش میں اپنے گھر خوش نہ کوئی غلام نہ کوئی آقا۔

حکومت اور مذہب کے نراج کا جوش ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان "میرے بیٹے کا ایمان" ہے بہت کچھ دھیما ہو گیا ہے اور اس نے ایک تعمیری شکل اختیار کر لی ہے۔

"ایک بلند و برتر ذات ہے ہماری آنکھوں سے مستور، ہمارے ادراک سے دور، میرا دل سے یہ ایمان ہے۔

"شیطان اور جن ہمارے ہی اندر ہیں۔ نہ جن کا وجود ہے نہ شیطان کا۔ انسان دنیا کو جنّت بنا دے گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔

"ارتقا سے تکمیل کو پہنچنا کائنات کی فطرت میں ہے۔ اس ارتقا اور تکمیل پر تورات، انجیل اور قرآن کے مطابق میرا ایمان ہے۔

"خوں ریزی سے تشدد بڑھتا ہے۔ تشدد سے اور خون ریزی ہوتی ہے۔ انتقام اور نفرت کی آگ خون کے چھینٹوں سے نہیں بجھ سکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔

"انسان آپس میں بھائی ہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ محض خواب ہے"! ...

خیر یوں ہی سہی۔ اس خواب پر ہزار دل و جان سے میرا ایمان ہے"

اس کے علاوہ اس نے اپنی تمام نظموں میں استبداد کی مخالفت کی ہے اور اسے تباہی کی علامت قرار دیا ہے۔ اس کے قومی گیت جو آئینی انقلاب کے آغاز میں گائے جاتے تھے ان میں سے ایک اس طرح شروع ہوتا ہے "اگر استبداد کے پاس توپیں ہیں، گولے ہیں۔ قلعے ہیں تو حق کا وہ بازو ہے جو کبھی شل نہیں ہوتا؟ اس کا وہ منہ ہے جو کسی معرکے میں نہیں پھرتا"

میں اس کی جس نظم کو سب سے بہتر سمجھتی ہوں وہ اونٹ کا سر ہے۔ یہ اس نے بچوں کے لئے بہت سہل اور پیاری زبان میں لکھی ہے میرے خیال میں یہ اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ کر کے ہر بچے کو پڑھایا جائے۔

"کسی زمانے میں ایک اونٹ تھا جس کا بڑا سا سر تھا۔ سر تو ہر اونٹ کا ہوتا ہی ہے مگر کہانی اسی طرح کہی جاتی ہے۔

"بھکھو کھا نکما سر غریب اونٹ کو پہاڑوں پہاڑوں لئے پھرتا تھا اور اسے مفت

میں تھکا تھکا مارتا تھا۔ اونٹ کا غریب بے ہنگم جسم اس کی فریاد کس سے کرتا۔ اس نے ایک کوّے سے شکایت کی تھی۔ کوّا بولا۔ اللہ نے تمھیں سر دیا ہے اس کا اٹھانا تمھارا کام ہے۔

"کوہان ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ دُم ماری ماری پھرتی رہی۔ اللہ نہ کرے کہ سر کی سرداری دم کو مل جائے۔ پہلے لوگ اونٹ کی فریاد کچھ سنتے بھی تھے مگر رفتہ رفتہ وہ اکتا گئے اور اُسے جھڑکنے لگے آخر بیچارہ اونٹ ایک خندق میں کود پڑا اور اُس کا سر ٹوٹ گیا۔ اونٹ نے کہا 'جا جہنم میں کمبخت' !

"جو سر ظلم کرے گا وہ ایک دن ٹوٹ کر رہے گا"

اس کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری مصرعہ پہلے کے مضمون سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ اور سب کہیں تو اس نے سر کی بیوقوفی کا ذکر کیا ہے اور آخری مصرعہ میں اس کے ظلم اور بے انصافی کا۔ مگر تعلیم کے اصول کے لحاظ سے میرے خیال میں یہ بڑی گڑ کی بات ہے اس لئے کہ جو بچہ اسے پڑھتا ہے وہ بے وقوفی اور بے انصافی کو ایک ہی چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اس سہل سے لٹکے سے اُس نے بدی کی سطح سے عقلمندی کے اس ملمع کو جو عوام کو اس پہ نظر آتا ہے اور اُن کے دلوں کو اس قدر لبھاتا ہے دو، کر دیا ہے۔

فکرت کے حلقے کے باہر دو بڑے انشاپرداز اور ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری ہو یہ دونوں اب تک زندہ ہیں اور ان کی تصنیف کا سلسلہ جاری ہے۔

ان میں سے ایک حسین رحمی ناول نویس ہے اس نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے اُس نے حقیقت نگاری اور طنز کا طرز اختیار کیا ہے اس کا موضوع استنبول کے ہر طبقے اور ہر قسم کے اشخاص کی زندگی ہے۔ مجموعی طور پر میرے خیال میں وہ ان ناول نویسوں میں جو پچھلے تیس سال کے اندر ہمارے ملک میں پیدا ہوئے سب سے ممتاز ہے۔

دوسرا محمد عاکف شاعر ہے جس کی افکار کمال فن اور زور بیان کے لحاظ سے فکرت سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ اس کا موضوع جمہور کی زندگی اور واقعات و حقائق ہیں، مگر وہ حقائق جن سے اس کے زمانے کے لوگوں کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اگرچہ اس کی اور فکرت کی خوب خوب چوٹیں چلتی تھیں مگر سچ پوچھئے تو دونوں کا مقصد ایک ہی تھا یعنی دنیا کو بہتر بنانا اور اس میں عدل و انصاف کا ڈنکا بجانا۔ فکرت یہ سمجھتا تھا کہ یہ مقصد ماضی کی نفی سے اور صرف عقل انسانی کی نشو و نما سے حاصل ہو سکتا ہے۔ عاکف کا عقیدہ یہ ہے کہ جو قوم ماضی کو کھو بیٹھے، اسے مستقبل سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور انسان کی اصلاح صرف صحیح مذہب ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اگرچہ وہ اسلام کا دل وجان سے حامی تھا مگر اس نے اسلامی دنیا کی نکتہ چینی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہم اس کی ایک طویل نظم "مشرق" کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصے تک سیاحت کی ہے

آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل، بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں۔ میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل، الٹی عقلیں دیکھیں یعنی ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریاکاری، قابلِ نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں؛ جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولھے، بنجر کھیت، میلی صورتیں، نکمے ہاتھ پاؤں دیکھے، میں نے بے جماعت کے امام دیکھے۔ بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں۔ راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں"!

نوجوان ترکوں کے عہد میں "ادبیات جدیدہ" والوں نے کم سے کم ایک خیال کی اشاعت پورے زور شور کے ساتھ کی وہ یہ کہ خواہ کچھ بھی ہو ترکی مغربی رنگ میں رنگ جائے۔ اس زمانے میں لوگوں کو تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی نہ صرف اعلیٰ تعلیم سے بلکہ عوام کی ابتدائی تعلیم سے بھی۔ اس حلقے کے لوگوں نے ایک تو تعلیم کی اشاعت کی غرض سے اور دوسرے مغرب سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کرنے کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے پر زور دیا۔ اس کا سب سے بڑا حامی حسین جاہد فکرت کے حلقے کا اخبار نویس اور انشا پرداز تھا۔ یہ خیال اس سے پہلے دوسروں کے ذہن میں آچکا تھا مگر وہ پہلا شخص تھا جس نے اس بحث کو اخباروں میں چھیڑا۔ لاطینی رسم الخط کی تجویز کی مخالفت عوام کے علاوہ اکثر تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف سے بھی بڑے زور شور کے ساتھ کی گئی۔ مخالفین کے دلائل یہ تھے (۱) اس کی وجہ سے ہم عالم اسلامی

سے بے تعلق ہو جائیں گے ۔ قرآن کو لاطینی رسم الخط میں ہرگز نہیں لکھنا چاہیئے ۔ عالم گیر اسلامی اتحاد کے حامی اسی بنا پر اس تجویز کے مخالف تھے (۲) دوسرے ملکوں کے ترکوں سے ہمارا تمدنی اتحاد باقی نہیں رہے گا ۔ روس میں تین کرور ترک ہیں جو ترکی زبان بولتے ہیں اور عربی حروف میں لکھتے ہیں۔ ان کا تمدن کم و بیش ہمارا ہی جیسا ہے ۔ تورانی اتحاد کے حامی اس بنا پر اس کے مخالف تھے (۳) ہماری قدیم تہذیب کا کل سرمایہ عربی حروف میں ہے ۔ ہماری ساری مستند کتابیں عربی اور فارسی زبان میں ہیں ۔ ترکوں نے عربی رسم الخط میں اپنے مذاق کے مطابق تصرف کر لیا ہے اور الفاظ کے حصول اور اُن کی آوازوں میں زیادہ مطابقت پیدا کر لی ہے ۔ اگر اسی قسم کی بعض تبدیلیاں اور کر دی جائیں تو یہ حروف لوگوں کو بڑی آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں ۔ یہ اعتراض قوم پرور جماعت کا تھا اس مسئلے کے متعلق کہ ترکی جدید علوم اور جدید خیالات کو اختیار کرے ڈاکٹر عدنان اپنی کتاب " سائنس اور مذہب " میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم قدیم قوموں کی مستند کتابوں کا مطالعہ مغربی ادب کے توسط سے کرنے کے بجائے اُن کی اصل زبان میں کریں تو ہمارا ادب جس میں مشرقی علوم کے خزانے پہلے ہی سے موجود ہیں اور بھی وسیع ہو جائے اور ہم ایک بالکل نئی اور اچھوتی چیز پیدا کر سکیں ۔

جہاں تک رسم الخط کی تبدیلی کا تعلق ہے ۔ لاطینی حروف اختیار کرنے کی تجویز کے علاوہ اور تجویزیں بھی پیش کی گئی تھیں ۔ ایک شخص نے جس کا نام شمس حقی تھا ایک

نیا رسم الخط ایجاد کیا تھا جو صوتی اصول سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا اور اس لئے اس کے پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ خود انور پاشا نے اس مسئلے پر غور کیا تھا اور عربی لکھنے کی ایک طرز نکالی تھی جس میں ہجے کرنے اور پڑھنے کی سہولت کا خیال رکھا گیا تھا مگر ان میں سے کوئی تجویز بھی چلنے نہیں پائی۔ ''ادبیات جدیدہ'' کے علاوہ تین اور ادبی تحریکوں نے اتحاد و ترقی کے عہد حکومت میں فروغ پایا۔

(۱) اتحاد اسلامی کی ادبی تحریک - ان میں سے ایک اتحاد اسلامی کی ادبی تحریک تھی۔ اس کے علم برداروں میں سب سے ممتاز محمد عاکف سمجھا جاتا تھا۔ اس حلقے کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار ''سبیل الرشاد'' کے نام سے نکلتا تھا جس کے ذریعے سے اس کے خیالات کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ ترک خالص اسلامی زندگی جیسی ابتدائی عہد اسلام میں تھی، اختیار کریں۔ معاشرت کی تبدیلی یا اصلاح کے نام تک سے اس حلقے کے لوگ بھڑکتے تھے۔ ارباب اتحاد و ترقی انھیں شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی قدامت پرستی کی مخالفت کی غرض سے حکومت کی طرف سے اسلامک ریویو نکالا گیا تھا۔ اس کی ادارت قوق آلپ ضیا کے ہاتھ میں تھی جو اتحاد و ترقی کے عہد کا عمرانی اور ایک لحاظ سے فلسفی کہا جا سکتا ہے۔

اسلامک ریویو یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے سے ایک حد تک یہ کوشش کی گئی کہ اسلام کی موجودہ حالت میں اصلاح ہو، خصوصاً مذہب کو علم اور معاشرت سے جو تعلق ہے اس کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔ اس میں قرآن کا

ترکی ترجمہ بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ خود توق آلپ ضیا اسے نہایت ضروری سمجھتا تھا کہ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کی حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل اصلاح و تجدید عمل میں لائی جائے۔

(۳) اتحاد تورانی کی تحریک۔ یہ آئینی انقلاب کے بعد توق آلپ ضیا کی سرکردگی میں عالونیکا سے شروع ہوئی۔ اس تحریک کے کئی پہلو تھے۔

زبان۔ ایک تو اس کے علم بردار ٹھیٹھ ترکی زبان کے حامی تھے جو غیر زبانوں کے کل الفاظ کو خارج کرنا چاہتے تھے۔ توق آلپ ضیا من جملہ اور باتوں کے اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا اور وہ اپنی نظموں میں ان الفاظ کے علاوہ جو عثمانیوں کے یہاں رائج تھے قبل عثمانی عہد کی ترکی زبان اور وسط الشیار کی ترکی بولیوں کے الفاظ ٹھونس دیتا تھا جنھیں لوگ مطلق نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس کا یہ دور زیادہ دن تک نہیں رہا۔

اس کے علاوہ اس کے پیرو اپنے ماضی قریب یعنی عثمانی عہد کی تہذیب کے تو شدت سے مخالف تھے مگر ماضی بعید یعنی ترکی نسل کے قدیم تمدن کے دل سے حامی تھے۔ توق آلپ ضیا نے ترکوں کے ملک وملت کی یہ تعریف کی ہے "ہمارا وطن نہ ترکی ہے، نہ ترکستان وہ ایک فضائے روحانی ہے یعنی توران"۔ سب سے بڑی خدمت جو اس حلقے کے لوگوں نے کی ہے۔ وہ ترکوں کی عمرانی زندگی کا علمی نظر سے مطالعہ ہے۔ محمد فواد کوپرولو نے جو اس زمانے میں ایک نوجوان شاعر اور عالم تھے پچھلے بیس سال کے اندر ان مسائل میں بہت کچھ تحقیق کی ہے، اور بہت قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

آج کل وہ یورپ اور روس کے علمی حلقوں میں جس قدر شہرت رکھتے ہیں اتنی کسی اور ترکی پروفیسر کو حاصل نہیں۔ دوسری چیز جس نے اُس حلقے کی قوت اور اثر کو بڑھا دیا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ نئی اصلاحات محض مغرب کی تقلید پر مبنی نہیں بلکہ ترکوں کی نفسی خصوصیات کی مظہر ہیں۔ ان لوگوں کا مقولہ تھا "میری ملت ترکی، میرا مذہب اسلام، میرا تمدن مغربی ہے"۔

(۳) قومیت کی ادبی تحریک | اس تحریک کا کوئی بانی یا قائد نہیں تھا مگر اس میں مختلف قسم کے سیاسی خیالات رکھنے والے، انشا پرداز، مضمون نگار، نقاد، محقق سب سے زیادہ تعداد میں شامل تھے اس کی نشو و نما فطری طور پر ہوئی اور اُس کی جڑیں ملک کی زمین میں پیوست تھیں۔ آرٹ کے لحاظ سے اس کے کارنامے بہت وقعت رکھتے ہیں۔

زبان | اس حلقے کے لوگ بھی اتحاد تورانی کے علم برداروں کی طرح ٹھیٹھ زبان پر بہت زور دیتے تھے مگر ان کے یہاں تکلف اور تصنع نہیں تھا وہ غیر زبانوں کے ان الفاظ کو جو ترکی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے باقی رکھنا چاہتے تھے، یعنی وہ قدما کی سند کے پابند نہیں تھے بلکہ مذاق عام کی تقلید کرتے تھے جو بیرونی الفاظ کو اپنا بنانے میں کمال رکھتا ہے۔ وہ مذہب کو زندگی کی ایک حقیقت تسلیم کرتے تھے اور اصلاح کی طرف مائل تھے۔ انھیں اتحاد توران کے حامیوں سے جو اختلاف تھا وہ ماضی کے متعلق تھا وہ ماضی کا مطالعہ تنقیدی نظر سے کرنا چاہتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ ترکوں کا حقیقی تمدنی سرمایہ یہی عہد عثمانی کی تہذیب ہے۔

رفیق خالد | اس کا کمال یہ ہے کہ وہ بول چال کی ترکی زبان سے ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کا کام لیتا ہے۔ وہ استنبول کی ترکی یعنی عورتوں کی زبان لکھتا ہے جو سادگی کے ساتھ ساتھ ایک خاص نزاکت رکھتی ہے اور محاوروں سے مالامال ہے۔ وہ طنز کا استاد ہے اور ایک عیب جو سب طنز نگاروں میں ہوتا ہے اس میں بھی ہے کہ وہ تصویر کا صرف ایک رخ دیکھتا ہے۔ اس کی نظر چیزوں پر اس طرح پڑتی ہے جیسے کسی درز کے اندر روشنی داخل ہوتی ہو مگر جتنے حصے میں پہنچتی ہے اسے آئینہ بنا دیتی ہے۔ اس کا موضوع زندگی کے حقیر، مکروہ، اور مضحک پہلو ہیں وہ نوجوان ترکوں کا سخت دشمن تھا۔ اور اس نے اپنے زمانے کے اشخاص اور واقعات کے خوب خوب خاکے اڑائے یہ ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے ہیں جس کا عنوان ہے "خارپشت کیا کہتا ہے"، محمود شوکت پاشا کے قتل ہو جانے کے بعد وہ جلا وطن کر کے اناطولیہ کے ایک شہر میں بھیج دیا گیا اور یہ ترکی ادب کے حق میں بہت اچھا ہوا۔ اس نے اناطولیہ کے قصبوں کے متعلق بہت سے افسانے لکھے اور قصباتیوں کی سیرت کی متعدد تصویریں کھینچیں۔ یہ چیزیں اس پائے کی ہیں کہ دنیا کی جس قوم کے ادب میں ہوتیں اس کے شاہکاروں میں شمار کی جاتیں یہ سچ ہے کہ یہاں بھی اس کا قلم صرف ادنی اور کمینہ صفات کا مرقع دکھاتا ہے اور حقیقت نگاری کا پورا حق ادا نہیں کرتا مگر اس محدود دائرے کے اندر اس نے واقعی کمال کر دیا ہے۔

عمر سیف الدین | عمر سیف الدین میں بجائے طنز کے جو تنگ نظری کی علامت ہے

وہ نادر چیز تھی جو سیدھے سادھے ترکوں کا حصہ ہے یعنی ظرافت۔ ظرافت کے معنی ہیں وسعت نظر، بات کے ہر پہلو کو دیکھنا۔ اس لئے جو لوگ ترکوں کی نفسی خصوصیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے عمر سیف الدین کی تصانیف خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نے جہاں کہیں اپنی قوم کی کمزوریاں بھی دکھائی ہیں کہ کس طرح بھولے بھالے ترک اپنے چالاک اور بے باک برادران وطن سے دھوکا کھاتے ہیں، وہاں بھی ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والا ہر فریق کے نقطۂ نظر کو سمجھتا ہے اور اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔

اس طبقے کے ناول نویسوں میں یعقوب قدری اور رشاد نوری کی بعض تصانیف نہایت قابل قدر ہیں یعقوب قدری کا وہ ناول جس میں بکتاشی سلسلے کی اندرونی زندگی دکھائی گئی ہے اور رشاد نوری کا افسانہ جس میں مفصلات کی ایک معلمہ کی سیرت کا مطالعہ ہے بڑے معرکے کی چیزیں ہیں۔

جمہوری دور

خواتین اور حضرات!

اگر ہم جمہوری عہد۔ یہ صرف ادبی جد وجہد کے لحاظ سے نظر ڈالیں تو یہ ذرا سی دیر کا کام ہے کیونکہ اس زمانے کے لکھنے والے جو قابل ذکر ہیں محض معدودے چند ہیں

اور اِن کا کوئی جداگانہ ادبی حلقہ نہیں ہے بلکہ وہی پرانے حلقے ابھی تک چلے جا رہے ہیں، جن میں سب سے ممتاز قومیت کے حامیوں کا حلقہ ہے۔ البتہ اس دور کی ذہنی تحریکیں اپنے مقاصد اور امکانات کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں اور ان کا ذکر بہت تفصیل چاہتا ہے۔

میں اس دور کی ذہنی اور ادبی تحریکوں کو دو قسموں کے تحت میں بیان کروں گی۔ ترکوں کی ذہنی تاریخ میں ابتدا سے ارباب فکر اور ارباب ادب کی تقسیم دو طبقوں میں چلی آرہی ہے۔ ایک تو وہ علما اور مصنفین جو حکومت کے ملازم ہیں اور علمائے رسوم یا سرکاری علما کہلاتے ہیں انھی لوگوں نے عثمانی سلطنت کی ابتدا میں عثمانی قوم کا تخیل پیدا کیا تھا اور نیم مذہبی انداز میں فرد کا تعلق ریاست سے اور دوسرے افراد سے معین کیا تھا۔ جو نظام انھوں نے قائم کیا تھا وہ میں آپ کو ایک نقشے کے ذریعے سے سمجھا چکی ہوں۔ ان کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ اس نظام کا استحکام برقرار رہے۔ اسی لئے وہ اسے مقررہ ضوابط کی زنجیروں میں جکڑ رکھنا چاہتے تھے اور ہر قسم کے تغیر کی مخالفت کرتے تھے۔ ان میں شعرا بھی تھے جو موجودہ حکومت کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا کرتے تھے۔

دوسرا طبقہ ان عالموں اور ادیبوں کا ہے جو علمائے خلق یا غیر سرکاری علما کہلاتے تھے۔ ان کے خیالات اور تصانیف کی بنیاد جمہور کی زندگی کے مشاہدے پر تھی۔ انھیں قومی زندگی سے گہرا تعلق تھا اور وہ اس کی ہر تحریک سے متاثر ہوتے تھے

سرکاری علما کا اثر کچھ تو اس وجہ سے جاتا رہا کہ ان کے خیالات میں جمود پیدا ہو گیا اور ان کی ترقی رک گئی کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مخالفت کے باوجود زمانے کا رنگ بدل گیا۔ انحطاط کے زمانے میں عہد تنظیمات کے ارباب فکر اور ارباب قلم کا درجہ سرکاری علما کے بین بین تھا۔ سرکاری انھیں اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ریاست کی تشکیل میں پورا دخل نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے ذہنوں پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ وہ ترکی میں نئے ادب اور نئے خیالات کے ہراول کہے جا سکتے ہیں۔

۱۹۰۸ء کے بعد نوجوان ترکوں کی حکومت نے سرکاری علما کے ایک نئے طبقے کی بنیاد رکھی تاکہ وہ ان کے خیالات کی اشاعت کرے۔ توق آلپ ضیا اس طبقے کا بانی اور سب سے ممتاز رکن تھا۔

اب ہم جمہوری دور کی ادبی اور ذہنی تحریکوں کا مطالعہ ان دونوں طبقوں میں الگ الگ کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ غالب تعداد سرکاری طبقے کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی ہے جو موجودہ حکومت کے خیالات اور اصولوں کی حمایت اور تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو دل سے ان اصولوں کے قائل ہیں اور بعض محض ذاتی فائدے کی وجہ سے ان کا ایک حلقہ جو "کدرو" کہلاتا ہے اس قابل ہے کہ اس پر غور سے نظر ڈالی جائے۔

کدرو کا حلقہ | کدرو ایک رسالے کا نام ہے۔ لفظ "کدرو" کے معنی ہیں "مربع"

اور اس سے فوج کے سپاہیوں وغیرہ کی ایک خاص ترتیب مراد ہے۔ اگر کوئی شخص سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا جائے تو کہتے ہیں کہ وہ کدروسے خارج کر دیا گیا۔ اس حلقے کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مصنفین اس میں شامل ہیں ان کے خیالات ضابطے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ حکومت کے ساتھ یاں کو ایک گٹھے ہوئے نظام کی شکل میں لے آئیں۔ یہ تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ اسی قسم کی چیز ہے جو توق آلپ ضیا کے پیش نظر تھی۔

سیاسی نظریہ | توق آلپ ضیا نے اپنا ریاست کا تصور ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا "فرد کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے جماعت ہے۔ حقوق کوئی چیز نہیں جو کچھ ہیں فرائض ہیں" یعنی وہ جمہوریت کا مخالف تھا یا یوں کہیے کہ ایک نئے طرز کی جمہوریت چاہتا تھا جس نے عملاً اقلیت یا ایک پارٹی کی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ کدرو کا حلقہ بھی اسی نظریے کا قائل ہے۔

تہذیب | توق آلپ ضیا کے عقائد کا پہلا اصول یہ تھا "میری ملت ترکی ہے" ملت سے اس کی مراد وہ ذہنی تہذیب اور اجتماعی احساس ہے جو ترکی زبان نے ہم میں پیدا کر دیا ہے۔ توق آلپ ضیا نے قدیم تہذیب کی تصریح کر دی تھی۔ وہ عثمانی تہذیب کا مخالف تھا اور وسط ایشیا کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ یہی خیال کدرو کے حلقہ کا بھی ہے۔ مگر چونکہ اس قدیم وسط ایشیائی تہذیب کا بچا کھچا سرمایہ موجودہ زمانے کے فلسفۂ حیات سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا اس لئے ارباب کدرو تاریخ کی نئی تفسیر اور تاویل کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ترکوں کی

نسل دنیا میں سب سے قدیم اور ان کی تہذیب سب سے پہلی تہذیب ہے میں یہاں اس دعوے کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں کرنا چاہتی صرف اتنا کہوں گی کہ جو قوم اپنے ماضی قریب سے محروم کی جا رہی ہے اس کے لئے نعم البدل بھی خوب تجویز کیا گیا ہے کہ وہ قدیم یونانیوں، ہطیوں، سمیریوں، عکادیوں کی وارث قرار دے دی جائے۔

تمدن | یہ تو ہوئی تہذیب رہا تمدن تو کدرو کا حلقہ آلپ ضیا کے دوسرے اصول کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ "میرا تمدن مغربی ہے" تمدن کا مفہوم ہے ظاہری معاشرت۔ نظام حکومت، طریق عمل وغیرہ۔

مذہب | توق الپ ضیا کا تیسرا اصول تھا "میرا مذہب اسلام ہے" ظاہر ہے کہ یہاں اسلام سے مراد اس کی اصلاح شدہ شکل ہے جو زمانے کی ضروریات کے مطابق ہو۔ آج کل کے سرکاری مصنف خواہ وہ کدرو کے حلقے کے ہوں یا نہ ہوں اس مسئلے میں خاموش ہیں۔ چونکہ مذہب اور ریاست ایک دوسرے سے الگ کر دئیے گئے ہیں اس لئے وہ مذہب کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتے ہوں گے۔ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کی دنیاوی ریاست نے مذہبی امور کا انتظام اپنے ہاتھ میں کیوں رکھ چھوڑا ہے تو خدا جانے وہ کیا جواب دیں گے شاید ان میں سے بعض یہ کہیں کہ اگر ہم مذہب اسلام کی تنظیم کو قوم کے ہاتھ میں دے دیں اور اس پر اپنی نگرانی نہ رکھیں تو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی نئی رجعت پسند قوت نہ پیدا ہو جائے جو ریاست کے لئے خطرناک ثابت ہو۔

اور ممکن ہے بعض اس پر راضی بھی ہو جائیں کہ مذہبی امور قوم پر چھوڑ دیئے جائیں۔

ان لوگوں کی کل تحریریں، خواہ وہ ناول ہوں یا مختصر افسانے یا مضامین اور مقالات، انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں۔ تعلیم، اخبارات اور ادب، تینوں کے اتحاد عمل سے ان کی تبلیغ اور اشاعت کامیابی کے ساتھ کی جا رہی ہے ان کے کام کا سب سے مشکل حصہ سلطنت عثمانی کے اثرات کا مٹانا تھا اس کے لئے انھیں رسم الخط کے بدلنے کا ایسا نادر موقع ملا ہے جو نہ روس کو نصیب ہوا نہ اٹلی کے فاشستوں کو نہ جرمنی کے نازیوں کو۔

لاطینی رسم الخط | رسم الخط کی تبدیلی کی پہلی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ کہا تھا کہ اس پر تین قسم کے اعتراض کئے گئے تھے۔ پہلا اعتراض اتحاد اسلامی کے حامیوں کا تھا کہ اس سے مسلمان قوموں کی سیاسی اور مذہبی یک جہتی کو نقصان پہنچے گا۔ موجودہ حکومت کے لئے یہ اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا اس لئے کہ وہ اس یک جہتی کی سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض اتحاد تورانی کے حامیوں کی طرف سے تھا کہ ہمارا تہذیبی اتحاد روس کے ترکوں کے ساتھ باقی نہیں رہے گا۔ ۱۹۲۶ء میں ترکوں کی کانگریس نے جو باکو میں ہوئی تھی لاطینی حروف کو اختیار کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اب تو لاطینی رسم الخط باہر کے ترکوں سے اتحاد پیدا کرنے میں اور مدد دے گا۔ تیسرا اعتراض قومیت پسندوں کا تھا کہ ہمیں عثمانی عہد کے ذہنی سرمائے سے کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس تعلق کو سرکاری علما خود ہی ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے ۱۹۲۸ء میں لاطینی رسم الخط

کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں تھی اور وہ اختیار کر لیا گیا۔

میں اپنے کسی سابقہ خطبے میں یہ کہہ چکی ہوں کہ جدید حکومت نے جو اصلاحات کیں اُن میں سے دو ایسی ہیں جن کا ترکوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑے گا۔ معاشرت کے نقطۂ نظر سے سوستان کے قانون خاندان کا نفاذ اور تہذیب کے نقطۂ نظر سے لاطینی رسم الخط کا اختیار کرنا۔

لاطینی رسم الخط کی موافقت اور مخالفت میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں انھیں میں آپ کے سامنے بیان کرتی ہوں۔

موافقت میں یہ کہا جاتا ہے کہ (۱) اس سے ترکوں کو مغرب سے ذہنی اتحاد پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ (۲) اسے سیکھنا اور سکھانا آسان ہے۔ اتنے ہی عرصے میں اس کے ذریعے سے بہت بڑی تعداد میں لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ چکے ہیں (۳) عربی اور ایرانی تہذیب کے غلبے سے آزاد ہونے کی یہی ایک صورت ہے۔ (۴) آیندہ نسلوں کو عثمانی عہد کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا بھی صرف یہی طریقہ ہے۔

مخالفت کرنے والے کہتے ہیں (۱) مغرب سے اتحاد محض ایک رسم الخط کے اختیار کر لینے سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ ذہنی اتحاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں کی تہذیب کی اصل ایک ہو۔ اگر پندرھویں صدی میں عثمانی ترک لاطینی اور یونانی ادب اور تہذیب کو اختیار کر لیتے تو شاید آج ہم میں اور مغرب میں اتحاد ہوسکتا مگر اب اس کا وقت نہیں رہا ہے (۲) ان لوگوں کی تعداد بڑھ جانا جو لکھ پڑھ سکتے ہوں تعلیم کی ترقی نہیں

کہی جاسکتی (۳۰) ہمارے لئے ایران اور عرب کی تہذیب سے قطع تعلق کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے اثر سے نہ تو ہم ایرانی بن گئے ہیں اور نہ عرب۔ ان دونوں قوموں کی تہذیب تمام مسلمان قوموں کی مشترک اصل ہے اور ہم بھی مسلمان ہیں (۳۱) نئی نسلوں کا رشتۂ تعلق عثمانی عہد سے قطع کر دینا ہرگز اچھا نہیں ہے۔ ہماری زندگی کی جڑیں عثمانی عہد کی تہذیب میں پیوست ہیں اس سے الگ ہو کر ہم نقلی مغربی بن کر رہ جائیں گے

بہر حال مخالفوں اور موافقوں دونوں کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آئندہ نسلوں کی ذہنی حالت میں بڑا زبردست تغیر ہو جائے گا جس کی نوعیت کا اندازہ اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔

سرکاری سنسنس کی ایک اور قابل ذکر کوشش یہ ہے کہ زبان خارجی اثرات سے پاک کر دی جائے۔ اس میں بھی وہ توفیق آلپ ضیا کے مقلد ہیں جو اناطولیہ کے باہر کی بولیوں کے الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کیا کرتا تھا۔ آگے چل کر اس نے اسے ترک کر دیا تھا۔ اس طرح کی کوشش سے زبان کی ہیئت کچھ عجیب ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کوشش کی کامیابی میں بہت شبہ ہے۔ زبان ایک زندہ چیز ہے اور وہ لوگوں کے ذہن میں اس طرح نشو و نما پاتی ہے کہ جوں جوں ان کے ادراکات اور احساسات وسیع ہوتے جاتے ہیں وہ انہیں ظاہر کرنے کے لئے الفاظ جو محض خیالات اور تصورات کی علامتیں ہیں گھڑتے جاتے ہیں۔

میں نے سرکاری مسعین کی جد و جہد کی جو واقعی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک

سچی اور مختصر تاریخ آپ کے سامنے پیش کر دی اِس طبقے کے لوگوں کے علاوہ دو مصنف اور قابل ذکر ہیں۔

ناظم حکمت یہ ایک نوجوان اشتراکی خیال کا شاعر ہے۔ میں نے اس کا انتخاب اس کے زور کلام کی وجہ سے کیا ہے۔ وہ مذہب پر کھلم کھلا حملہ کرتا ہے اور اس معاملے میں توفیق فکرت سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس نے ماسکو میں تعلیم پائی ہے اس وجہ سے اس کے طرز خیال اور طرز تحریر پر موجودہ روس کے ان انشاپردازوں کا اثر پڑا ہے جو بہت جنگ جو واقع ہوئے ہیں۔ مگر اس میں جدت طبع بھی ہے اور وہ چیز بھی ہے جسے خداداد جوہر کہتے ہیں۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اس کی سب سے ممتاز تصنیف ہندوستان کے متعلق ہے۔ یہ ایک ڈراما ہے جس کا عنوان ہے "بنرجی نے خودکشی کیوں کی"۔ وہ ہندوستان سے صرف اتنی ہی واقفیت رکھتا ہے جو اس نے کتابوں سے یا ہندوستان کے اشتراکی نوجوانوں کی صحبت سے حاصل کی ہے اس لئے اس ڈرامے کے اشخاص اصل میں ترک ہیں جن کے ہندوستانی نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس میں اس نے ایک طرف تو مغربی شہنشاہیت کی خبر لی ہے اور دوسری طرف اپنے ملک کی حالت پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ خیالات کے لحاظ سے وہ ارباب کدرو سے زیادہ اختلاف نہیں رکھتا، اس لئے کہ وہ بھی پرانی حریت پسندی کی تحریک کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، طبیعت اور مذاق کے لحاظ سے وہ ان کا سخت مخالف ہے۔ میں ایک ٹکڑا نقل کرتی ہوں جس میں اس نے کلکتے کے ایک مجمع کا ذکر کیا ہے۔

"میدان میں لوگوں کا مجمع تھا میں کیا بتاؤں بھائی کتنا بڑا مجمع!

"اس کا شور الامان! الامان! جیسے جنگل میں طوفان۔ اف وہ خوفناک مجمع!

"کلکتے کے مزدور، کشمیر کے مزدور، بمبئی کے ملاح۔

"انسانوں کا ہجوم تھا یا سات سمندروں کی ریت!

"ننگ دھڑنگ بچے جھنڈ کے جھنڈ درختوں کی شاخوں میں لٹکے ہوئے، بوڑھی عورتیں مکانوں کی سیڑھیوں پر بھری ہوئی، سوئی کا کیا ذکر اگر ڈاڑھی کا ایک بال بھی پھینکو تو زمین پر نہ گرے۔

"میدان میں ایک مجمع تھا ایک خوفناک مجمع۔ اس نے سمندر کی کالی کالی لہروں کی طرح مجھے حلقے میں لے لیا۔ مجھے غرق کر دیا۔ اف وہ خوفناک مجمع"!

وہ اس سے بہت چڑتا ہے کہ مغربی مصنف مشرق کو عجیب و غریب طلسمات بنا کر دکھاتے ہیں اس نے پیر لوتی سے خطاب کرکے جو نظم کہی ہے اس کا ایک بند یہ ہے:۔

" راز ہائے سربستہ۔ قناعت، قسمت، سرائے، کارواں! چاندی کے تھال میں ایک شہزادی ناچتی ہوئی۔ مہاراجہ، بادشاہ۔ ہزار برس کا بوڑھا درویش! ایک عورت ناک پر مہندی لگائے، پیرے کپڑا بنتی ہوئی، سبز ڈاڑھی کا امام، منارہ پر اذان دیتا ہوا۔ یہ مشرق نہ پہلے تھا نہ اب ہے، نہ کبھی ہو گا۔ مشرق وہ ملک ہے جہاں ننگے مزدور محنت کا پسینہ بہاتے ہیں اور مر جاتے ہیں، وہ سرزمین ہے جو ہر قوم کی ملکیت ہے سوائے خود اہل مشرق کے"!

اس نوجوان شاعر کی اس نظم کا جو اس کے خیالات کا سب سے بہتر نمونہ پیش کرتی ہے عنوان ہے "میں چاہتا ہوں کہ ایک مشین بن جاؤں" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان اشتراکی دنیا مادی، بے روح، مشین جیسی زندگی سے قریب قریب مذہبی عقیدت اور عشق رکھتی ہے اس کو پڑھنے کے بعد یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ روس کے کسان مشین کی شکل کے بت بنا کر اسی جوش کے ساتھ پوجتے ہیں جیسے وہ اولیا کی شکل کے بتوں کو پوجا کرتے تھے۔

"کھٹ کھٹ۔ دھڑ دھڑ، دھک دھک، میں چاہتا ہوں کہ ایک مشین بن جاؤں"

"میرے دماغ میں، میرے دل میں، تمناؤں کا ہجوم ہے جس مشین کو دیکھتا ہوں میرا دل چاہتا ہے لپٹ جاؤں۔ میری زبان ہر تار کو چومتی ہے۔ میری رگوں میں موٹریں اور انجن چلتے ہیں۔

"کھٹ کھٹ، دھڑ۔ دھڑ، دھک دھک میں چاہتا ہوں کہ ایک مشین بن جاؤں"

علاوہ انتہا پسند اشتراکی مصنفوں کے جن کا نمائندہ ناظم حکمت ہے، اور سرکاری مصنفوں کے جن نمائندہ کدرو کا حلقہ ہے، ترکی کے موجودہ انشا پردازوں میں ایک اور قابل قدر شخص ہے جس کا نام ضیا حلمی ہے۔ وہ اعلی درجہ کا تربیت یافتہ اور قابل نوجوان ہے جس نے اپنے خیالات میں سب سے الگ راہ اختیار کی ہے جو چیزیں اسے اوروں سے ممتاز کرتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) سو سال سے ترکی کا تعلیم یافتہ طبقہ جس مغرب کی تقلید کی دھن میں ہے وہ

انیسویں صدی کا مادیت پرست مغرب ہے جس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے گذشتہ تین صدیوں کے علمی انکشافات سے فائدہ اٹھا کر طرح طرح کی مشینیں بنا ڈالی ہیں۔ ضیا حلمی میرے خیال میں پہلا مشرقی نوجوان ہے جس کی نظر اس سے آگے پہنچتی ہے۔

(۲) ترکی کا وہ طبقہ جو مغربی تعلیم سے متاثر ہوا ہے دو نسلوں سے اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ اپنی تاریخ کے عثمانی عہد اور سلجوقی عہد کو بیچ میں چھوڑ کر قبل تاریخی عہد سے اپنا سلسلہ ملائے اور اس سے ہدایت حاصل کرے۔ ضیا حلمی نے اپنا سرچشمۂ ہدایت تیرھویں صدی کے اناطولی دور یعنی سلجوقی دور کو قرار دیا ہے۔

اگر ہم ضیا حلمی کا تعلق مغرب کی کسی موجودہ ذہنی تحریک سے تلاش کرنا چاہیں تو اس کے حالات "جدید انسانیت" کے علم برداروں سے مشابہ نظر آتے ہیں مگر وہ محض ان کا نقال نہیں ہے اس کا یہ خیال ہے کہ ترکی تاریخ کے عہد سلجوقی میں وہ سامان موجود ہیں جن پر وہ اپنے فلسفے کی تعمیر کر سکتا ہے۔

اس کی سب سے اچھی کتاب "محبت کی شریعت" ہے۔ یہ ایک خیالی ریاست کا بہاس واضح خاکہ ہے جس کے بنانے میں اس نے بڑے من چلے پن کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ افلاطون کے خیالات سے متاثر ہوا ہے مگر پھر بھی اس میں اتنی جدت ہے کہ اس کی کتاب بہت قابل قدر سمجھی جاتی ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا ترجمہ ہر اس ملک میں ہونا چاہیے جہاں مشرق اور مغرب کی ذہنی اور اخلاقی کشمکش جاری ہے۔

فن تمثیل | کسی قوم کے ادب کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے فن تمثیل پر بھی ایک نظر نہ ڈالی جائے۔

ترکوں میں فن تمثیل قصہ گوئی سے شروع ہوا قصہ لکھنے والے قصے کے اشخاص کی تمثیل بھی دکھاتے جاتے ہیں۔ انھیں مداح کہتے ہیں اس کا رواج عربوں اور ایرانیوں میں بھی تھا قصے اس طرح کے بیان کئے جاتے ہیں جو دلچسپ بھی ہوں اور نصیحت آموز بھی ہوں۔ یہ قصہ گو اپنے کمال سے سلطان کو خوش کرتے تھے اور قہوہ خانوں، بازاروں اور میلوں میں عام لوگوں کو بھی محظوظ کیا کرتے تھے۔ ہنگری کے ایک مستشرق ڈاکٹر کونش نے ان پرانے قصوں کو جمع کر کے شائع کیا ہے وہ کہتا ہے "اگر آپ کا یہ خادم جو ایک کمگاری کا بیٹا ہے اب سے پینتالیس سال پہلے ان قصوں کو سن کر جمع نہ کر لیتا تو یہ ضائع ہو جاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مجھ تک پہنچے۔ میں انھیں ایک متبرک تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں"

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ترکی تواریخ میں ان قصہ گویوں کے بہت کچھ متفرق خیالات مل جاتے ہیں ان کے بعض قصے بھی استنبول کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں "تیغ زن خاتون" کا قصہ سب سے بہتر اور مکمل ہے۔ اس میں ایک شخص کا قصہ ہے جس نے بہت سا مال ترکے میں پایا ہے۔ ترک ان لوگوں کو ہمیشہ سے حقیر سمجھتے ہیں جو دولت یا مرتبہ خود حاصل نہیں کرتے بلکہ بزرگوں سے پاتے ہیں اس میں ڈرامے کی تاثیر پوری پوری موجود ہے۔

قصہ گوئی کا رواج اب تک باقی ہے۔ ان میں سے بعض بالکل نئی وضع کے ہوتے ہیں۔ جیسے یورپ کے اسٹیج پر رتھ ڈرپیر اور ایورن پر ان تان۔ یہ سب خواہ نئی وضع کے ہوں یا پرانی وضع کے ہوں نقل میں کمال رکھتے ہیں۔ کسی اچھے قصہ گو کا قصہ سنئے تو واقعی بڑا لطف آتا ہے۔ ایک ہی سلسلے میں وہ بے تکلف مختلف قسم کے انسانوں اور حیوانوں کی نقلیں کرتا ہے۔ مثلاً کسان کی، لونڈی کی، پاشا کی، گدھے کی، بلی کی۔ بھیس بدلنے کا کوئی خاص سامان اس کے پاس نہیں ہوتا۔ بس ایک رومال یا کپڑا ہوتا ہے جو نقاب، عمامہ غرض سب کچھ بن جاتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ جو بھیس چاہے بدل لیتا ہے۔ قصے کے دوران میں وہ معاشرتی اور سیاسی واقعات اور اشخاص پر چوٹیں بھی کرتا جاتا ہے۔

قصہ گوئی نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے تھیٹر کی شکل اختیار کی اور یہ سترھویں صدی میں ترکی زندگی کا ایک اہم جز بن گیا۔ اس زمانے میں تھیٹر کی بارہ مشہور کمپنیاں قائم تھیں۔ ایک کمپنی میں کبھی کبھی دو سو سے زیادہ کام کرنے والے ہوتے تھے۔ ان میں گانے والوں اور ناچنے والوں کے طائفے، نٹوں کی ٹولی، نقال، قصہ گو اور ایکٹر شامل تھے۔

ان میں سب سے مشہور کمپنی "عقیدہ" کہلاتی تھی۔ اس کا ڈائرکٹر اور منیجر ایوب پہلوان تھا۔ یہ بڑا ظریف، خوش خلق اور قابل آدمی تھا۔ اس کا ناچنے والوں کا طائفہ سترھویں صدی میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس کے تماشوں کی فہرست میں

بہت سے ناٹکوں کا ذکر ہے مثلاً "باغبان اور باغبانی"، "بلی اور چوہا"، "چوہا اور گلہری"، "ہنس"، "کوے"، "بطخیں"، "گلیوں کے کتوں کی زندگی"، "اونٹوں کی زندگی"، "چانڈو باز"، "تمباکو نوشی"۔ تمباکو نوشی اس زمانے میں افسوسناک اور مضحک دونوں پہلو رکھتی تھی۔ یہ نئی نئی ترکی میں آئی تھی۔ مراد چہارم جو ترکی تاریخ کا ایک نہایت ظالم بادشاہ گذرا ہے تمباکو پینے والوں کا ویسا ہی دشمن تھا جیسا نیرو عیسائیوں کا۔ وہ بھیس بدل کر سڑکوں پر پھرتا تھا، مکانوں کے دودکشوں سے تمباکو کی بو کا پتہ چلاتا تھا اور تمباکو پینے والوں کو قبرستان میں جا کر پکڑتا تھا جہاں وہ اکثر جا کر چھپا کرتے تھے۔ "عقیدہ" کو اس قسم کے واقعات کا مضحک پہلو دکھانے میں کمال حاصل تھا۔

یہ کمپنیاں "کھلے تھیٹر" کے نام سے ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سوانگ اور نقلیں دکھائی جاتی ہیں عوام کا بھیس بنانا اور اُن کی زندگی کا نقشہ دکھانا واقعی انھیں کا حصہ ہے۔ ان میں عورتوں کا پارٹ مرد کرتے ہیں۔

کرانمیز یا فانوس خیال | اس کے علاوہ فانوس خیال کا بھی رواج تھا اور اب بھی ہے۔ یہ فن چینیوں سے لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جیکوبی نے اپنی کتاب "فانوس خیال کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ یہ فن ترکوں میں مغلوں سے آیا اور ان میں چینیوں سے۔ ترکی مصنف اس کی تردید کرتے ہیں اور وہ اس میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ عثمانی ترکوں نے اس فن کو عربوں اور ایرانیوں سے حاصل کیا یا

تینوں کے یہاں اس کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی۔

عربوں کے یہاں یہ چیز باطنی اور فلسفیانہ اہمیت رکھتی تھی۔ تیرھویں صدی میں محی الدین عربی دمشق میں اس سے تصوف کے مسائل کی تشریح کا کام لیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ خیالی تصویریں کائنات کا نمونہ پیش کرتی ہیں اور پردۂ تصویر خالق کائنات کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اپنی ذات کا جلوہ دکھاتا ہے۔ مصر میں بھی اس چیز سے اخلاقی تعلیم میں مدد لی جاتی ہے۔

چودھویں صدی میں ہمیں بروصہ کے ترکوں میں یہ فن فروغ پر نظر آتا ہے اس کی ابتدا کے متعلق ایک عجیب حکایت مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ جب مسجد جامع کی تعمیر ہو رہی تھی تو دو مزدور تھے جو ہر وقت ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے اور سب مزدوروں کو ہنساتے تھے۔ ان کی وجہ سے کام میں خلل پڑتا تھا اس لئے یہ قتل کر دئے گئے۔ فانوس خیال میں ان دونوں کے کیریکٹر دکھائے جاتے ہیں۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں میں شیرش کا مادہ اس زمانے میں بھی موجود تھا۔ اس تماشے کا ہیرو کراگیز بروصہ میں اب تک ولی مانا جاتا ہے۔ وہ عام ترکوں کی سیرت کی ایک مثال ہے جس سے ان کی سمجھ، واقعیت پسندی اور پاکیزہ ظرافت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ بڑے آدمیوں کا مضحکہ اڑاتا رہتا ہے۔ اس کا دوست حاجی عیوض سرکاری علما کی زمانہ سازی کا نمونہ ہے اور ہر بات کی تاویل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حکام اور امرا کے لئے مفید ہو۔

ترکوں کے یہاں فانوس خیال میں وہ مذہبی رنگ نہیں تھا جو عربوں کے یہاں تھا۔ البتہ اشارے کنائے میں سیاسی معاملات کا ذکر آجاتا تھا۔ عبدالحمید کے حکم سے ان کی سختی سے نگرانی کی جاتی تھی۔

انیسویں صدی تک فن تمثیل ان ابتدائی شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا۔ ان سیدھی سادی چیزوں میں بھی اس قوت تخلیق اور مطابقت فطرت کی جھلک نظر آتی ہے جو ترکوں کا خاصہ ہے بشرطیکہ وہ بیرونی اثرات سے آزاد ہوں

جدید تھیٹر | اس کا آغاز عہد تنظیمات میں ہوا۔ اس کا پہلا مشہور ڈراما نویس نامق کمال تھا۔ گدیک پاشا کے مقام پر تھیٹر کھولا گیا اور ایک کمپنی نے جس کا مہتمم ایک قابل ارمنی گل اگوپ تھا نامق کمال کی تمثیلیں اور غیر زبانوں سے ترجمہ کئے ہوئے ناٹک دکھانے شروع کئے۔ اب تھیٹر نئے خیالات کی تعلیم کا مرکز بن گیا اور لوگوں کو اس سے بےحد شغف پیدا ہوگیا۔ مگر جو ناٹک دکھائے جانے تھے وہ تبلیغ و اشاعت کے لحاظ سے کتنے ہی مفید ہوں مگر ان میں وہ جدت خیال اور آرٹ کی وہ خوبیاں نہیں تھیں جو سیدھے سادے دیسی تھیٹر کے تماشوں میں تھیں۔ اب رہی اس کی سیاسی اہمیت اُسے عبدالحمید نے مٹا دیا غرض نیا تھیٹر عموماً ترجمہ کئے ہوئے ناٹک دکھاتا رہا۔ اس ابتدائی دور میں اس میں ارمنی ایکٹر اور ایکٹریس ہوتی تھیں اگرچہ ان میں سے بعض اپنے فن میں کمال رکھتے تھے مگر ان کی زبان اور تلفظ اچھا نہ تھا حالانکہ ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی زبان تھیٹر اور عدالت میں پوری صحت کے ساتھ

استعمال کی جائے۔ بہرحال چونکہ ترکی عورتوں کا اسٹیج پر آنا ایسی چیز تھی جو خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی اس لئے ارمنی ایکٹرسوں ہی سے کام لیا جاتا رہا۔ جدید تھیٹر کا دوسرا مرکز ترکی میں بروصہ تھا۔ اسے احمد وافق پاشا نے قائم کیا تھا جو عہد تنظیمات میں اس صوبہ کا گورنر اور مشہور انشاپرداز تھا۔ اس نے مولیئر کے ڈراموں میں تصرف کرکے انھیں ترکی میں منتقل کیا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے ان کا ایسا اچھا ترجمہ اور کسی زبان میں نہیں ہوا۔ یہ تھیٹر خالص ترکی رنگ کا تھا ترکوں سے مولیئر کے ڈراموں کے بہت اچھے اچھے ایکٹر پیدا کئے ہیں۔ مگر ان ترجموں کو مولیئر سے برائے نام کی نسبت تھی۔ وافق پاشا نے اس پردے میں خود اپنے ملک کی معاشرتی پستی اور علما کی ریاکاری کا ہو بہو نقشہ دکھایا ہے اور اس کی دھجیاں اڑائی ہیں

اس کے علاوہ کھلے تھیٹر نے بھی باوجود اس کے کہ اسے حکومت کے ڈر سے بڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی بعض اعلیٰ درجہ کے ایکٹر پیدا کئے مگر جو ہی ان میں سے کوئی شخص ہر دل عزیزی حاصل کرنے لگتا تھا عبدالحمید اسے بلاکر اپنے محل میں رکھ لیتا تھا جس کی غرض حقیقت میں یہ تھی کہ وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

۱۹۰۹ء میں نوجوان ترکوں نے فرانسیسی نائم تھیٹر آنتوان کو مقرر کیا کہ وہ ایک نیا تھیٹر قائم کرے اور فن تمثیل کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولے چنانچہ ایک مدرسہ دارالبدائع کے نام سے اس کی نگرانی میں قائم ہوا اور نشوونما پاتا رہا۔ اس میں تعلیم پاکر اچھے ایکٹر نکلنے لگے اور جدید طرز کے مصنفوں نے نئی ترکی زندگی کے

متعلق ڈرامے لکھنے شروع کر دئے۔ ترکی تھیٹر میں اب تک فرحیہ ڈرامے (کامیڈی) پر زور دیا جاتا ہے جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ترکی کے ایکٹروں کی طبیعت اسی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے ۱۹۲۳ء کے بعد دو چیزوں نے اس تھیٹر میں انقلاب برپا کر دیا۔ ایک تو یہ کہ ترکی عورتیں اسٹیج پر آنے لگیں دوسرے یہ کہ ایک نہایت قابل شخص ارطغرل محسن اس کا ناظم مقرر ہوا جس کی دل سے یہ آرزو ہے کہ اُسے ایک اعلیٰ درجے کا ترکی تھیٹر بنا دے وہ خود ایک بہت بڑا ایکٹر ہے اور اس نے پیرس میں جرمنی میں اور اس کے بعد روس میں مائر ہولڈ اور استانسلا وسکی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں اس سے ایک فلم بھی تیار کرایا گیا تھا۔ اس تھیٹر میں اب مشرقی اور مغربی ڈرامے نہایت خوبی سے کئے جاتے ہیں شیکسپیر کے ڈرامے جس خوبی سے یہاں دکھائے جاتے ہیں انگلستان کے باہر بہت کم ملکوں میں دکھلائے جاتے ہوں گے۔ اس نے کئی اچھوتے فرحیہ ڈرامے ایک اندھے بوڑھے مصنف کے جس کا خاص موضوع عثمانی عہد کی زندگی ہے پیش کئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ صرف استنبول کو جو ترکی کا ذہنی مرکز ہے بلکہ دوسرے شہروں کو بھی تھیٹر سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ قومی تھیٹر سال میں چند مہینے سمرنا، طربزون اور دوسرے صوبوں میں دورہ کیا کرتا ہے۔

یہ ترکی ادب کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ اس میں بھی مشرق اور مغرب کی کشمکش اسی طرح نظر آتی ہے جیسے اور شعبوں میں۔ مگر شکر ہے کہ یہاں مشرقی

روح ابھی تک ہلاک نہیں ہوئی ہے اگرچہ وہ مغربی ادب کے طرز ادا اور فنی خصوصیات کا بہت غور سے مطالعہ کر رہی ہے مگر ابھی تک اس کی کوشش یہ ہے کہ اپنے لئے اظہار کی الگ راہیں نکالے۔ آیندہ خطبے میں ہم اسی نقطۂ نظر سے ترکی عورتوں کی حالت کے نشو و نما سے بحث کریں گے۔



ساتواں خطبہ

خواتین وحضرات!

ترکی میں ایک مثل ہے "عورتیں خواہ کسی قوم کی ہوں سب ایک ہیں" مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ قول نہایت دانشمندی پر مبنی ہے خواہ مردوں میں نسل اور قوم کی کتنی ہی تفریق کیوں نہ ہو عورتوں میں کوئی نہیں۔ ترکی کا مرد شاید ہندوستان کے مردوں کو نہ سمجھ سکے مگر ترک عورت بے تکلف ہندوستانی عورتوں کو سمجھ سکتی ہے اور اسی طرح ہندوستانی عورت ترکی عورتوں کو۔ عورت کی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے معاشرتی فرائض ساری دنیا میں یکساں ہیں۔

تاریخ کے ابتدائی دور کے متعلق اب تک جتنی معلومات حاصل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی معاشرتی ارتقا میں بلا لحاظ ملک اور قوم کے مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں عورت ہی نے انسانی معاشرت کو حیوانی زندگی سے جدا کر کے تمدن کی بنیاد رکھی ہے۔ جب باپ کی موجودہ حیثیت تسلیم کی گئی اور وہ بقائے نسل اور اولاد کی خبر گیری کا ذمہ دار قرار پایا اُس سے

ہزار ہا سال پہلے سے ماں کا مرتبہ مسلّم تھا۔ عورت نے بچوں کی پرورش کا بوجھ اٹھایا اور اُن کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کے لئے زراعت اور صنعت بالکل ابتدائی شکل میں شروع کی۔ اسی نے خاندان کی بنیاد ڈالی اور اُسے انسانی معاشرت کی وحدت قرار دیا۔ رفتہ رفتہ اس مرکز کے گرد تمدن کا پورا دائرہ بن گیا خدا جانے کن کن مصیبتوں سے عورت نے مرد کو اہلی زندگی کا خوگر بنایا ہوگا اور خاندان کے رشتے میں باندھا ہوگا اس لئے کہ وہ خلقی طور پر انفرادیت پسند جنگ جو اور خود پرست واقع ہوا ہے اور یہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے اس لئے کہ تمدن کی تخلیق میں یہ صفات بھی ناگزیر ہیں۔

جب قدرت نے عورت کے سپرد خاندان کی تعمیر کی جس سے رفتہ رفتہ قوم بن گئی تو اس نے عورت کو دو ایسی صفات عطا فرمائیں جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ انتہائی قدامت پسندی اور انتہائی انقلاب پسندی۔

خاندان یا خاندانوں کے اس مجموعے کے گرد جسے قوم کہتے ہیں رسوم و روایات۔ زبان خیال اور ادب کا ایک دائرہ بن جاتا ہے عورت قدامت پسند اسی وقت تک ہے جب تک یہ سب چیزیں خاندان یا قوم کی بقا کا باعث ہوں مگر انسانوں کا ہر مجموعہ گویا جسم حیوانی کا ایک خلیہ ہے جس کی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ٹوٹتا رہے، بڑھتا رہے اور وسیع تر اور پیچیدہ تر مجموعے بناتا رہے۔ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر عورت بھی اُن بڑے انقلابات اور بڑے مذاہب کی

حمایت کرتی ہے۔ جو ایک فرسودہ اور جامد سوسائٹی میں نئی روحانی اور مادّی قوتیں پیدا کرتے ہیں۔ اسلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والی اور سب سے پہلے شہادت کا درجہ حاصل کرنے والی عورتیں ہی تھیں۔ فرانسیسی انقلاب اور روسی انقلاب میں بھی عورتوں نے حصّہ لیا اور اپنی جانوں کی قربانیاں کیں۔ یہ بہت کم ہوتا ہو کہ وہ ان ہنگاموں میں پیش پیش ہوں یا اُن کی صنف کو اُن سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔ مگر جہاں کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے ایک جان بلب قوم کے زندہ ہونے کی امید ہو تو سب عورتیں یا کم سے کم ان میں سے بہت سی اس کا ساتھ دیں گی اور اس کی خاطر ہر طرح کی تکلیفیں سہیں گی ظاہر ہے کہ میں معمولی عورتوں اور مردوں کا ذکر کر رہی ہوں۔ بعض غیر معمولی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن میں عورتوں سے زیادہ مردوں کی صفات پائی جاتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس صنف میں داخل ہیں۔ ان سے کچھ ضروری نہیں کہ نوع انسانی کو فائدہ ہی پہونچے۔ بہر حال یہاں معمولی انسانوں کا ذکر ہے۔

میرے خیال میں عورت انسانی معاشرت کا حیاتی عنصر ہے۔ اس سے فطرت یہ کام لیتی ہے کہ وہ تمدّنی زندگی کو فروغ دے اور اس میں جمود نہ پیدا ہونے دے۔ مرد اس کا ذہنی عنصر ہے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کی نئی نئی شکلیں سوچتا ہے وہ فطرت اور عورت کو تسخیر کرنا چاہتا ہے اور تمدّن پر اپنا نقش بٹھانا چاہتا ہے دنیا کی تاریخ میں اب تک یہی ہوتا رہا ہے۔ اس وقت ہم مستقبل سے بحث نہیں کریں گے

بلکہ صرف اس پر نظر ڈالیں گے کہ جو تمدن گذر چکے ہیں ان میں مرد و عورت کا کیا حصہ رہا ہے۔

ترقی یافتہ تمدنوں کی تعمیر عورتوں سے کہیں زیادہ مردوں نے کی۔ ان میں عورتوں کی حیثیت ان مقاصد کے لحاظ سے مختلف رہی جن پر ان کے بانیوں نے زیادہ زور دیا ہے۔ جب کسی تمدن کا نصب العین اعلیٰ درجے کا آرٹ اور فلسفہ یعنی محض حسن اور مجرد خیال رہا تو اس میں عورتوں کو کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں دی گئی قدیم یونان میں اس کی مثال ایتھنز کی سوسائٹی ہے۔

ایتھنز میں عورتوں کی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بہو بیٹیوں کی حیثیت بہت کم سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کے تین طبقے تھے (۱) لونڈیاں جن کی حیثیت وہی تھی جو غلاموں کی (۲) شریف عورتیں۔ شادی کے قابل صرف یہی سمجھی جاتی تھیں اور جائز اولاد بھی صرف انھیں کی تسلیم کی جاتی تھی مگر انھیں کوئی مدنی حقوق حاصل نہ تھے۔ وہ مکانوں کے کوٹھوں سے نیچے نہیں اترنے پاتی تھیں اور ہر وقت گھر کے کام دھندے میں لگی رہتی تھیں۔ تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے اور زمانے کی رسم کے مطابق وہ اپنے اعلیٰ تربیت یافتہ شوہروں کی رفاقت کا حق ادا کرنے سے معذور تھیں۔ ان کے کوئی آثار ایتھنز کی تاریخ میں باقی نہیں ہیں۔ (۳) تیسرا طبقہ طوائفوں کا تھا جو "مصاحبات" کہلاتی تھیں۔ ان کو بیویوں کے حقوق حاصل نہیں تھے مگر مدنی حقوق کل حاصل تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ

اور تربیت یافتہ ہوتی تھیں اور قدیم ایتھنز کی علم اور آرٹ کی زندگی میں ان کا بہت بڑا اثر تھا۔ پیری کلیس کے زمانے میں جو یونان کا عہد زرّین سمجھا جاتا ہے، اسپاشیا نام ایک عورت بڑی نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ سقراط نے ایک اور عورت دیوتیما کا ذکر کیا ہے جس سے اس نے تعلیم وہدایت پائی۔ یہ سب غیر ملکی عورتیں تھیں۔ اور "مصاحبات" کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کی سوسائٹی غیر معمولی قابلیت کے اشخاص پیدا کرنے کے لئے موزوں تھی۔ مگر کیا ہم اسے ایک پائیدار اور معاشرتی نقطۂ نظر سے پسندیدہ سوسائٹی کہہ سکتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مصاحبات کی وجہ سے لوگوں کا اخلاق بہت خراب ہوگیا تھا اور گویا طوائفوں کو سرکاری حمایت حاصل تھی۔ یہ چیز بہت زیادہ عرصہ تک چلنے والی نہیں تھی۔ جو شخص قدیم ایتھنز کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اس کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں (۱) کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ بیویوں کو تعلیم دی جاتی اور وہ اپنے شوہروں کی رفیق بن سکتیں کیا اس عجیب وغریب رسم کو جس نے لوگوں کے اخلاق کو بگاڑ دیا ایتھنز کے زوال میں دخل ہے؟

اسی قسم کے سوالات افلاطون کے ذہن میں پیدا ہوئے ہوں گے جب اس نے ایتھنز کی سوسائٹی پر غور کیا ہوگا اور دوسرے یونانی تمدنوں سے، جو بہت مختلف اصول پر مبنی تھے اس کا مقابلہ کیا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے اپنے ریاست کے نصب العین میں اس کی حمایت کی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے

حقوق مساوی ہوں چاہے ان کا کام الگ الگ ہو۔

افلاطون کو جو تمدن ایتھنز کے تمدن سے صریحی طور پر مختلف نظر آیا ہوگا۔ وہ اسپارٹا کا تھا۔ وہاں اعلیٰ درجے کے آرٹ اور فلسفہ پر زور نہیں دیا جاتا تھا بلکہ صحت اور قوت اور استحکام پر۔ اس طرح کی سوسائٹی میں افراد کی تربیت نہایت احتیاط سے ہونی چاہیئے، خصوصًا ماؤں کی۔ ان کی جسمانی تربیت ایسی ہونا چاہیئے کہ وہ تندرست بچے پیدا کر سکیں۔ ان میں اتنی ذہنی قابلیت ہونا چاہیئے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دے سکیں اور اتنا بلند اخلاق کہ ان میں اعلیٰ سیرت اور اخلاقی صفات پیدا کر سکیں۔ اسپارٹا کی سوسائٹی میں اخلاقی اور جسمانی قوت کا معیار بہت بلند تھا کیونکہ ہر فرد کے جسم اور روح کی تربیت ہم آہنگی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ہر مضبوط قوم جس کے پیش نظر اس قسم کا نصب العین تھا اپنی عورتوں کی تربیت میں خاص اہتمام کرتی رہی۔

اس کے بعد رومہ کی باری آئی جو کم و بیش یونان کا شاگرد تھا۔ اہل رومہ عورتوں کی حیثیت کے متعلق معقول خیالات رکھتے تھے۔ ان کے یہاں تقسیم محنت کے اصول پر عمل ہوتا تھا۔ مرد زیادہ تر باہر کا کام کرتے تھے اور عورتیں گھر کا مگر ان میں باہم مساوات اور رفاقت کا برتاؤ تھا رومی خاتون اعلیٰ درجے کی ذہنی اور اخلاقی صفات کی مالک ہوتی تھی اس کا اثر رومہ کی تاریخ میں صاف نظر آتا ہے۔ مگر انسانی معاشرت میں ہر چیز پہلے رسم کے طور پر شروع ہوتی ہے پھر قانون

کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ عملاً مردوں اور عورتوں میں مساوات تھی مگر قانوناً یہ صورت نہیں تھی۔ عورتیں عمر بھر دوسروں کی ولایت میں رہتی تھیں۔ پہلے ان کا ولی باپ ہوتا تھا۔ پھر شوہر۔ اصولاً وہ ہمیشہ نابالغ سمجھی جاتی تھیں جب روما میں معاشرت کا صحیح نصب العین باقی نہیں رہا تو مرد اس قانونی تفوق سے جو انھیں عورتوں پر حاصل تھا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ وہ اپنی بیویوں کو بری طرح مارنے پیٹنے لگے اور ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دیتے تھے یہاں تک کہ عورتوں میں شورش پیدا ہوگئی اور وہ اپنے شوہروں کو زہر دے کر مارنے لگیں۔

جمہوریہ روما کے آخری زمانہ میں رومی مورخ لیوی نے عورتوں کے بلووں کا ذکر کیا ہے یہ اس ہنگامے سے بہت مشابہ تھے جو انگلستان میں حقوق طلب عورتوں نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک برپا کر رکھا تھا آخر میں جمہوری حکومت نے مجبور ہو کر انھیں ملکیت اور زوجیت کے حقوق عطا کیے اور شادی نے قانونی معاہدے کی شکل اختیار کر لی جسے بعض حقوق نسواں کے حامی آج کل بھی پسند کرتے ہیں۔

چونکہ رومیوں کا مقصد ایک صحیح اور پائدار معاشرت قائم کرنا تھا اس لئے ان کے یہاں عورتوں کی حیثیت کے متعلق بعض نہایت معقول نظریے پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک زینونی فلسفی موسونیس روفس کے نتائج افکار ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر تعلیم اور مواقع ملنے چاہئیں۔ یہ سچ ہے کہ عورت اور مرد ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اس لئے اُن کے کاموں میں فرق ہے اور ہونا چاہیئے۔

مگر دونوں میں سے کسی کے لئے یہ قدغن نہ ہو کہ فلاں کام ہرگز نہ کرے کیوں کہ بعض مرد ایسے ہوتے ہیں جو ہلکے کاموں کے لئے موزوں ہیں اور بعض عورتیں ایسی نکل آتی ہیں جو بھاری کام خوب کر سکتی ہیں۔ اخلاق میں اس نے دونوں کے لئے ایک ہی معیار رکھا ہے جو نہایت بلند اور پاکیزہ ہے۔ شادی میں وہ میاں بیوی کی مساوات کا قائل ہے اور ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد رفاقت اور مشترکہ ذمہ داری کو قرار دیتا ہے۔

اب رہی عیسائیت تو جب تک وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم پر مبنی تھی اس میں عورت اور مرد برابر سمجھے جاتے تھے۔ اس نے نکاح کو ایک مذہبی رسم قرار دیا جو کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی تھی۔ اور وحدت ازدواج کا قانون جاری کیا جس نے مغربی سوسائٹی کو اس قدر مستحکم کر دیا۔ مگر قرون وسطیٰ میں جب سینٹ پال اور آبائے کلیسا نے مذہب عیسوی کو کلیسا کی شکل میں منظم کیا تو عورتوں کو بہت ادنیٰ حیثیت دی گئی۔ شادی اور جنسی تعلقات گناہ قرار پائے معاشرت کا مرکز گھر کے بجائے خانقاہ بن گئی شہادت پانے والی اور خانقاہ کا انتظام کرنے والی عورتیں تو عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور سب شیطان کی ذریات، گناہ ازلی اور ہبوط آدم کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھیں بلکہ کلیسا کی ایک مجلس نے تو یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ عورتیں روح نہیں رکھتیں۔

چھٹی صدی میں اسلام کا دور دورہ ہوا اور اس نے عورتوں کی حیثیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اسلام کا بہت بڑا مقصد یہ تھا کہ انسانی معاشرت میں عدل

اور مساوات پیدا کرے پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ایک صنف کے حقوق کو نظر انداز کر دے۔ اسلام سے پہلے عرب میں عورتیں حیوانوں کے برابر سمجھی جاتی تھیں مرد کو اختیار تھا کہ جتنی عورتیں چاہے رکھے وہ اپنی بیویوں کو قتل کر سکتا تھا، اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر سکتا تھا۔

اسلام نے نکاح کی رسم جاری کی۔ بیویوں کی تعداد کو محدود کر دیا اور علیحدگی کی صورت میں شوہر پر نان و نفقہ ادا کرنے کی پابندی عائد کر دی۔ اس کی بدولت عورتوں کے ساتھ عام طور پر اچھا سلوک ہونے لگا اور بدکاری کی سزا مردوں اور عورتوں کو یکساں دی جانے لگی۔

مگر اسلام کی سب سے بڑی اہمیت دنیا کے جدید تمدن میں یہ ہے وہ پہلا نظام ہے جس میں عورتوں کو قانونی اور معاشی حقوق عطا کئے گئے اور وہ مردوں کی دست نگر نہیں رکھی گئیں۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (مردوں کا حق ہے اس پر جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حق ہے اس پر جو وہ کمائیں)۔

میرے خیال میں اس آیت میں دو زبردست اصول بیان کئے گئے ہیں جن کے بغیر کسی معقول سوسائٹی کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ (۱) عورتیں فاعل مختار اور اپنے افعال کی ذمہ دار ہیں، مغرب نے اس اصول کو تیرہ سو سال بعد تسلیم کیا (۲) دوسری چیز جس کا اس آیت میں ذکر ہے بے حد اہم ہے اور اس کا اثر صرف عورتوں کے حقوق یا اسلامی معاشرت تک محدود نہیں یہ وہ اصول ہے جس پر آئندہ انسانی معاشرت کی بنیاد قائم ہوگی۔

ہر شخص کا حق صرف اس چیز پر ہے جو وہ کمائے اس کے علاوہ کسی چیز پر نہیں یہ ہر گز جائز نہیں کہ ایک طرف مخلوق فاقے کرے اور دوسری طرف چند افرادبے قیاس دولت کے مالک ہوں ۔اس آیت میں نہایت بلاغت کے ساتھ یہ مطلب ادا کیا گیا ہے کہ اپنے ابنائے جنس کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ان کے حقوق سے محروم نہ کرو۔

اسلام کی دو رسموں کو آج کل مہذب دنیا خصوصاً نئی روشنی کے مسلمان اسلامی معاشرت کے زوال کا باعث قرار دیتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں ان دونوں چیزوں پر نظر ڈالنی چاہتی ہوں۔

(۱) پردہ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی وہ صورت نہیں تھی جو اب ہے۔ اگر ہم پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ نظر آئے گا کہ آپ اپنے زمانے کے عربوں کی اس غیر مہذب عادت کے ابتدا سے مخالف تھے کہ ان کے مرد اور عورتیں قریب قریب برہنہ رہا کرتی تھیں۔ آنحضرتؐ کی حیا مشہور ہے۔ آپ کی کھلائی بیان کرتی ہیں کہ بچپن میں جب کبھی آپ کے کپڑے اُتارے جاتے تھے تو آپ رونے لگتے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ مہذب معاشرت کی بنیاد دو جذبوں پر ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں ایک تو حیا اور دوسرے کراہیت، یعنی وہ نفرت جو میلی کچیلی چیزوں سے اور گندی حرکتوں سے طبیعت میں پیدا ہوتی ہے۔ آنحضرت نے یہ دونوں جذبے اپنے زمانے کے لوگوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات غور کے

قابل ہے کہ اسلام خیر و شر کو حسن و قبح کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کو نظر میں رکھ کر آنحضرتؐ کے اُن احکام پر غور کیجئے جو انھوں نے عورتوں کے لباس کے بارے میں صادر فرمائے ہیں۔ یہ کلام الٰہی کی اس آیت کے مطابق ہیں جن میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے سر اور سینے اور زینت کو چھپائیں۔ چہروں کے چھپانے کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ عورتوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ گھر میں بیٹھی رہیں کوئی خدمت عامہ انجام نہ دیں۔ خود آپ کی بیوی نے ملک اور قوم کی خدمت میں امتیاز حاصل کیا۔ ان احکام میں دو باتیں غور کے قابل ہیں ایک تو یہ کہ عورتوں کو مہذب لباس پہننے کی تاکید کی گئی ہے اور آرائش کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر انھیں تنبیہہ کردی گئی ہے کہ اپنے حسن اور نسوانیت سے مردوں کو رجھانے کی کوشش نہ کریں۔ یہی بات ہے جس پر موجودہ زمانے میں عورتوں کے حقوق کے حامی زور دیتے ہیں بلکہ ہر صحیح معاشرت کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ اس معقول اصول کی بدولت ہمیں اسلام کے آغاز میں بہت سی عورتیں نظر آتی ہیں جو معلم، شاعر، واعظ بلکہ سپاہی کی حیثیت سے بھی کام کرتی تھیں۔ مگر جب اسلام نے ان قدیم تمدنوں کا اثر قبول کرلیا جو کم سے کم مقامی معاشرت کے اعتبار سے انحطاط کی حالت میں تھے تو عورتیں نہ صرف نقاب پہننے لگیں بلکہ انھیں گھر سے نکلنے کی اور خدمت عامہ انجام دینے کی ممانعت کردی گئی۔ اس سے اسلامی معاشرت کو بہت شدید نقصان پہنچا۔ عورتوں کی صحت بہت گر گئی ان کی تعلیم میں غفلت برتی

جانے لگی اور مردوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ عورتیں ان کی ملکیت ہیں۔ اگر اس پردے کو مسلمان قائم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اختیار ہے۔ مگر وہ یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی بنا مذہب کے احکام پر ہے۔

(۲) تعدد ازدواج۔ یہ رسم عرب میں اسلام سے پہلے عام تھی اسلام نے اسے بہت ہی محدود دائرے میں جائز رکھا۔ وہ چاروں ائمہ جنھوں نے نویں صدی میں فقہ اسلامی کی بنیاد رکھی اگر چاہتے تو اس آیت کی تفسیر اس طرح کرتے کہ بلا ضرورت ایک سے زیادہ شادی کرنے کو جرم قرار دیتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ پردے اور تعداد ازدواج کی رسمیں جاری رہیں۔ ان میں سے پردہ اس صورت میں جواب رائج ہے کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کی حالت میں برابر تنزل ہوتا رہا۔ دوسری چیز یعنی تعدد ازدواج کی حمایت البتہ ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے بدکاری کم ہو گئی اور دوسری بیوی کی اولاد کو قانونی حقوق حاصل ہو گئے۔ مگر اس سے نقصان یہ پہنچا کہ اسلامی خاندان کے اتحاد میں خلل پڑ گیا اور اس کی قوت گھٹ گئی۔ اسلام کے عہد متاخر میں یہ بات صاف نظر آتی ہے۔ عیسائی دنیا کی عورتوں کے لئے تو یہ مشکل تھی کہ انھیں معاشی حقوق مردوں کے برابر حاصل نہ تھے اور مسلمان عورتوں کے لئے یہ مصیبت تھی کہ انھیں خاندان کے اندر اپنے شوہروں کی رفاقت کا درجہ کبھی حاصل نہ ہو سکا۔

مغرب میں پہلے تو نائٹوں کے نظام کی بدولت عورتوں کی حیثیت کچھ بڑھ گئی۔

پھر نشاۃ ثانیہ نے خاندان کی بنیاد کو مستحکم کر دیا۔ انقلاب فرانس نے اور آگے قدم بڑھایا اور یہ مطالبہ کیا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ فرانسیسی فلسفی کونڈورسے اس بات کا بہت مخالف تھا کہ نوع انسانی کا نصف حصہ وضع قانون میں شرکت کرنے سے معذور رکھا جائے وہ کہتا ہے "انسانی حقوق کی بنا اس چیز پر ہے کہ انسان ذی فہم مخلوق ہے۔ اخلاقی تصورات حاصل کرنے کی اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے"

اور لیمپ دوگوژ نے اپنے "اعلان حقوق نسواں" میں کہا ہے قوم کی فرماں روائی کے معنی صرف یہ ہیں کہ عورتوں اور مردوں میں اتحاد ہو" ایک اور مقام پر کہتا ہے "اگر عورت کو سولی پر چڑھنے کا حق ہے تو اُسے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا حق بھی ہے"

۱۸۴۸ء کے بعد عورتوں کے حقوق کی حمایت میں ایک عالمگیر تحریک شروع ہوئی فنلستان نے عورتوں کو پارلیمنٹ کے انتخابات کا حق رائے دہندگی ۱۹۰۶ء میں دیا۔ آئس لینڈ نے ۱۹۰۷ء میں ڈنمارک ۱۹۱۰ء میں اور ناروے نے ۱۹۱۵ء میں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ سب ملک معاشرتی حیثیت سے دنیا کے مہذب ترین ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔

تحریک نسواں کے مختلف دور پہلا دور جمہوری تھا اور وہ نتیجہ تھا فرانسیسی انقلاب کے اثر کا۔ اس دور میں عورتوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا گیا اس کے خیالات سب سے بہتر طریقے سے جان اسٹوارٹ مل کے شاہکار "عورتوں کی محکومی" میں ظاہر کئے گئے ہیں یہ تحریک تعلیم کے میدان میں شروع ہوئی اور نشو و نما پاتی رہی

جب اس میں انھیں قریب قریب مساوات کا درجہ حاصل ہوگیا تو انھوں نے معاشرتی حقوق کا مسئلہ اٹھایا۔ اس میں انھیں اتنی کامیابی ہوئی کہ علاوہ بہتر حقوق زوجیت حاصل کرنے کے وہ اپنے اپنے دائرے میں معاشرتی خدمت اور تنظیم کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دینے لگیں۔ عورتوں ہی کی بدولت مغرب میں رفاہ عام کا کام ایک باضابطہ فن بن گیا۔ امریکا۔ انگلستان، فرانس اور خصوصاً بلجیم میں عورتوں کو یہ تربیت دی جانے لگی کہ سوسائٹی کے بدنصیب طبقوں کو پستی کے گڑھے سے نکال کر ان کی حالت درست کریں۔ مغرب کی عورتیں غریب عورتوں، بچوں۔ بیماروں اور مجرموں کی زندگی کا مطالعہ کرتی ہیں، اور ان کی صحت تعلیم۔ اور عام معاشرتی حالت کی اصلاح اور ترقی کی کوشش کرتی ہیں۔ سب سے آخر میں اس تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ عورتوں نے جمہوری حکومتوں میں کوئی مفید سیاسی خدمت انجام دی ہے یا نہیں، اور اب تو یہ حکومتیں خود انقلاب کی حالت میں ہیں۔

تحریک نسواں کا دوسرا دور معاشی حقوق کے مطالبہ کا ہے جمہوری دور میں تو مقابلہ عورتوں اور مردوں کا تھا مگر اس دور میں ایک طبقے کے مرد عورت مل کر دوسرے طبقے سے لڑ رہے ہیں۔ مشینوں کی تہذیب اور صنعتی ترقی نے انیسویں صدی کے وسط میں سوسائٹی کے نظام کو بدل دیا اور اس کا مرکز گھر کی جگہ کارخانے کو بنا دیا۔ نظام معاشرت کی وحدت اب خاندان نہیں رہا۔ مزدوری پیشہ عورتوں کے متعلق سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جن ملکوں پہ صنعتی رنگ غالب ہے ان میں یہ ناممکن ہے کہ عورتیں کارخانے کو چھوڑ کر

دوبارہ گھر کی زندگی اختیار کرسکیں۔ اس کی سب سے واضح مثال امریکا ہے وہاں عورت کے لئے گھر میں کوئی کام ہی نہیں رہا ہے۔ پہلے زمانے میں عورت گھر کا سارا کام کرتی تھی اور اس طرح محض طفیلی بننے سے محفوظ رہتی تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ بچوں کی پرورش تک ماہرین فن اور کنڈر گارٹن کے معلم کے سپرد کردی گئی ہے اس لئے اگر وہ گھر پر رہے تو اس کو طفیلی بن کر رہنا پڑے گا۔ آدھے انسانوں کا مصوصاً ماؤں کا محض بیکار رہنا نوع انسانی کا اتنا بڑا انتزل ہوگا جو ہرگز گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ غرض یہ مسئلہ مغرب میں بجد نازک اور پیچیدہ ہے اور اگر صنعت اور مشین کا یہی دور دورہ رہا تو اس سے خدا جانے کیا نتائج پیدا ہوں گے۔ شکر ہے کہ مشرق کو اس قسم کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔

اب ہمیں ترکی کی عورتوں پر نظر ڈالنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان کی حالت پر مشرق اور مغرب کی کش مکش کا کیا اثر پڑا ہے۔

ترکی کی عورتیں قوموں کی سیرت کے متعلق کلیات قائم کرنا عموماً درست نہیں سمجھا جاتا مگر جتنی معلومات ہم اس وقت حاصل کرسکتے ہیں اس کی بنا پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کی معاشرت اتھنز کی سوسائٹی کی بہ نسبت اسپارٹا کی سوسائٹی سے زیادہ مشابہ تھی۔ میرے خیال میں ترکوں کے ادب اور ان کے نظام ریاست کی خصوصیات سے آپ کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ انفرادی قدروں کے مقابلے میں اجتماعی قدروں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ ایسی سوسائٹی نہیں بنانا چاہتے تھے جو علم اور آرٹ کے رنگ

میں ڈوبی ہوئی ہو بلکہ ایسی جو تندرست قوی اور پائدار ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں اس کی ضرورت ہے کہ مرد اور عورت یکساں محنت اور خدمت کریں

خوش قسمتی سے ہم اس وقت تک ترکی میں سادہ ترین معاشرت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ابھی تک بعض خانہ بدوش قبائل باقی ہیں جو مشرق ادنیٰ میں عثمانی ترکوں سے پہلے یا اُن کے بعد آئے ہوں گے۔ ان میں ایک بہت بڑی جماعت یوروق کہلاتی ہے۔ ان کے یہاں وہی ابتدائی رسم و رواج چلا جا رہا ہے اور وہ سب سے زیادہ خالص نسل کے ہیں۔ بہ خلاف شہر کے رہنے والوں اور کسانوں کے وہ دوسری قوموں سے شادی بیاہ نہیں کرتے ہیں انکی زبان اور وہ پیٹرن جو زبان سے متعلق ہیں سب بالکل خالص ہیں۔ مجھ سے نیویارک میں ایک روسی ماہر لسانیات نے کہا کہ ان کی زبان میں وہ الفاظ پائے جاتے ہیں جو طرغانہ کے کتبوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر اسلام قبول کر چکے ہیں اور شیعی طریق کے پابند ہیں۔ عورتوں کی جو حیثیت اُن کے یہاں ہے اُسے دیکھ کر یورپ کے تحریک نسواں کے علم بردار بہت خوش ہوں گے۔ مردوں اور عورتوں میں بالکل مساوات ہے اور وہ ہر کام میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ عورتیں سر کو خمار سے ڈھک لیتی ہیں مگر ان کا چہرہ کھلا رہتا ہے۔ ان کے حسن کا یہ عالم ہے کہ میں نے جتنی قوموں کی عورتیں دیکھی ہیں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ اپنے قبائل کے اور باہر کے مردوں سے بے تکلف ملتی جلتی ہیں اور اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کی بہت ہی سختی کے ساتھ پابند ہیں۔

لڑکے لڑکیاں بغیر ماں باپ کی مداخلت کے شادی کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے رفیق حیات کو خود منتخب کرتے ہیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں ساتھ کام کرتے ہیں، ساتھ کھیلتے ہیں، شادی کے بعد طلاق کی نوبت کبھی نہیں آتی ہیں نے ان میں سے کسی کی ایک بیوی کے سوا دوسری بیوی نہیں دیکھی۔ طلاق صرف بدکاری کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ صورتیں بہت ہی شاذ ہیں۔ اور ان میں مرد و عورت دونوں کو بالکل ایک سی سزا دی جاتی ہے جو بہت سخت ہوتی ہے ان کے یہاں اخلاق کا معیار دونوں کے لئے یکساں ہے۔

عثمانی ترکوں کا ابتدائی عہد:- ہم اس سے جائز طور پہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عثمانی ترک جو خود بھی معدودے چند خانہ بدوشوں کی حیثیت سے آئے تھے ایسی ہی زندگی رکھتے ہوں گے۔ بعض قبیلے جن کا نام تاریخ میں عثمانی ترکوں کے ساتھ ساتھ آتا ہے مثلاً "کالی بکری" "کالا گوشت" "سفید بکری" "سفید گوشت" اب تک موجود ہیں۔ اگرچہ وہ پوری یا آدھی شہری زندگی اختیار کر چکے ہیں لیکن ان میں بھی بہت سی ابتدائی رسمیں اب تک باقی ہیں۔ ان کی عورتیں مردانہ صفات رکھتی ہیں یعنی وہ بڑی مضبوط سیرت کی اور کھری ہوتی ہیں۔ ترکی میں عام لوگ عورتوں کی تعریف عموماً اس طرح کے الفاظ میں کرتے ہیں "وہ تو خاصی مرد ہے"۔ یہ کوئی نہیں کہتا "وہ بڑی خوبصورت ہے"۔ اس قوم کے دل میں ابھی تک اخلاقی صفات کی عظمت اور اہمیت مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں ہے۔

عہدِ بروصہ | آپ سُن چکے ہیں کہ عثمانی ترکوں نے اپنی ریاست پہلے پہل بروصہ میں قائم کی تھی اس سادہ مگر دلکش تہذیب کے ابتدائی دور میں یہ نظر آتا ہے کہ ترکوں نے ہر لحاظ سے اپنی قدیم خاندانی صفات کو قائم رکھا تھا چودھویں صدی کا عرب سیاح ابن بطوطہ ان کے ملک میں گیا تھا۔ بروصہ میں وہ سلطان سے ملنے کے لئے گیا سلطان موجود نہیں تھا مگر سلطانہ نے اس سے ملاقات کی اور ملکی امور کے متعلق گفتگو کرتی رہی شاہی محل سے لیکر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ہر جگہ آزادی مساوات اور سادگی نظر آتی تھی۔ ابن بطوطہ ترکی عورتوں (خصوصاً کریمیا کی عورتوں) کی آزادی کی شکایت کرتا ہے جو اُسے سڑکوں پر پھرتی، خرید و فروخت کرتی نظر آتی تھیں۔ اس کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے جس طبقے میں سے تھا اس کے خیالات عورتوں کے متعلق کچھ اور تھے۔

مسلمان عثمانی ترک جنھوں نے اپنی ریاست اور تہذیب کی ابتدا اس قدر سادگی اور خوبی کے ساتھ کی تھی رفتہ رفتہ بہت بدل گئے۔ پہلے تو سلاطین، امرا، بلکہ میرے خیال میں عوام بھی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کرنے لگے اس سے ان میں زیادہ تغیر نہیں ہوا۔ اس لئے کہ باہر کی عورتیں ان میں مل جل جاتی تھیں۔ تغیر کے اسباب دوسرے تھے فتوحات کا اور دوسری قوموں کے ساتھ کا ان پر بہت اثر پڑا اور اس کی وجہ سے تعدد ازدواج کم سے کم دولت مند طبقوں میں رواج پا گیا اس کے علاوہ وہ بازنطینی رسم و رواج سے بہت متاثر ہوئے۔ غرض استنبول

کے فتح ہونے کے بعد حکمراں طبقے میں بڑا زبردست انقلاب ہوگیا۔ اور اس کی ابتدا خود سلطان سے ہوئی۔

استنبول کے فتح ہونے کے بعد ترکی سوسائٹی صاف طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہوگئی۔ سلطان اور ارکان سلطنت نے اپنے گھروں میں بازنطینی طریقے اختیار کئے مثلاً پردہ، عورتوں کے لئے علیحدہ مکان، خواجہ سرا۔ نہ صرف تعدد ازدواج بلکہ داشتہ رکھنے کی قبیح رسم بھی رائج ہوگئی۔ اب تک سلطان غیر ملکی شہزادیوں سے شادی کیا کرتے تھے۔ اب وہ صرف لونڈیوں سے کرنے لگے۔ ان کے ہاں کی عورتیں صرف ان کے عیش و آرام کے لئے تھیں۔ سوسائٹی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

مگر متوسط طبقے اور ادنٰے طبقے میں بعض پرانی رسمیں اب تک باقی تھیں ان کی عورتیں نقاب ڈال کر بے تکلف باہر آتی جاتی تھیں۔ البتہ انھیں بجز خاص صورتوں کے خاندان کے باہر کے لوگوں سے ملنے کی ممانعت ہوگئی۔ ان طبقوں کے لوگ لونڈیاں رکھتے تھے مگر داشتہ رکھنے کی یا تعدد ازدواج کی مثالیں بہت کم پائی جاتی تھیں۔ اگر متوسط درجے کی کسی ترکی عورت کا شوہر دوسری شادی کرلے تو وہ اس کی زندگی دشوار کردیتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ دونوں بیویاں مل کر اس کی خبر لیتی تھیں۔ یہ سب چیزیں بہت تکلیف دہ تھیں اور ان کا اثر بچوں پر بہت برا پڑتا تھا۔

البتہ ماؤں کے حقوق ان سب تغیرات کے باوجود قائم رہے۔ ماں کی محبت اور عزت دنیا میں عام ہے مگر ترکوں میں یہ جذبہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اکثر بہوؤں کے لئے بہت مشکل ہوتی تھی مگر بڑی بی کے انتقال سے پہلے اس کی استبدادی حکومت سے نجات پانا ناممکن تھا۔

حرم اور سیاست عثمانی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جو عورتوں کی سلطنت کا دور کہلاتا ہے یہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے درمیان کا زمانہ تھا جس میں عثمانی سلطنت کا تنزل انتہا کو پہنچ گیا تھا سلطان کے حرم کے متعلق جو عام طور پر مشہور ہے کہ جاہل عورتوں کی جماعت تھی جس نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا تھا۔ بالکل غلط ہے۔ ان میں اعلیٰ درجے کی تنظیم تھی اور ان کی تعلیم بھی اچھی خاصی ہوتی تھی۔ مگر یہ عورتیں دنیا سے بے تعلق ہو کر ایک تنگ دائرے میں رہتے رہتے سودائی نہیں تو مراقی ضرور ہو گئی تھیں۔ جب سلیمان اعظم کی بیوی خرم سلطان نے شہزادوں کو محل میں قید رکھ کر تعلیم دینے کا طریقہ جاری کرایا تو گویا اس نے ترکی کے آئندہ فرماں رواؤں کو ایک نہایت محدود، مریض اور عیاش سوسائٹی کا پابند کر دیا۔ اس کے بعد جو سلطان گذرے وہ محل کی عورتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھے۔

اگرچہ ان میں بعض قابل اور ذہین عورتیں بھی تھیں جن سے ملک کو فائدہ پہنچا لیکن مجموعی طور پر حرم کی مداخلت سیاست میں، خصوصاً ایسے ناقص نظام کے تحت بہت مضر ثابت ہوئی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ والدہ سلطان پہلے ہی سے سیاست میں

دخیل تھی۔ وہ ملک کے بن لکھے قانون کے مطابق اپنے بیٹے کے اختیارات میں شریک سمجھی جاتی تھی۔ لیکن سلطان کی بیویوں اور داشتہ عورتوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کرتی تھیں سلطان کے ذریعے سے کرتی تھیں۔ سازشوں کا بازار گرم تھا اور رشوت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان حسین عورتوں کے ہاتھوں عہدوں اور منصبوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ان کی ادنیٰ سی خوشی کے لئے خزانے لٹتے تھے آدھی آدھی رات کو وو کانوں سے زیور، جواہرات، ریشم اور زربفت کے تھان چھین کر لائے جاتے تھے۔ حرم کی عورتوں کے علاوہ قصہ گو عورتیں اور مصاحبیں محل میں پہنچتی تھیں۔ اور سازشوں میں شرکت کرتی تھیں یہ "سمور کا زمانہ" جس میں سلطان کے ایک نامعقول شوق کے بدولت مسلسل آٹھ برس تک ملک مصیبت میں مبتلا رہا، انھیں میں سے کسی عورت کے تخیل کا کرشمہ تھا۔ سلطان ابراہیم کو جو ایک مجنون شخص تھا اور انتہا سے زیادہ ظالم اور فاسق تھا، کسی کہانی میں یہ سنایا گیا کہ پرانے زمانے میں کسی بادشاہ نے اپنے محل کی دیواروں کو سیاہ سمور سے آراستہ کیا تھا۔ اس نے فوراً صوبے کے حاکموں اور امیروں کو حکم دیا کہ جہاں سے ممکن ہو سیاہ سمور لاکر پیش کریں تاکہ وہ ان سے اپنی ایک منظور نظر کے محل کی آرائش کرے۔

اگرچہ محل کی خواتین کا دخل سیاست میں حد سے زیادہ مضر تھا۔ لیکن عام طور پر عورتیں رفاہ عام اور تعلیم کے کاموں میں جو کوشش کر رہی تھیں اس کے نتائج ایسے بُرے زمانے میں بھی مفید ثابت ہوئے۔

خدمت خلق اور رفاہ عام:- جن جن عمارتوں پر ترکی کو ناز ہے وہ سب کسی بیوی یا ماں کی یادگار میں بنائی گئی ہیں بلکہ عورتوں نے خود بھی بے شمار مسجدیں، سرائیں، حوض، پل وغیرہ تعمیر کرائے ہیں۔ محل کے اندر اور باہر سب عورتیں کچھ تو دین داری کے جوش میں اور کچھ رسم کے خیال سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کوئی نہ کوئی کار خیر ضرور کرتی تھیں۔ عمومی عمارات میں سے اکثر عمارات عورتوں کی بنوائی ہوئی اور وقف کی ہوئی ہیں جس کی نظر سے اوقاف کا دفتر گذرا ہو اس کے دل پہ ان مخیر عورتوں کے جذبہ ہمدردی کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ ہم ان کے بعض مفید ترین کاموں کا ذکر کریں گے تاکہ ان کی فیاضی اور طبعیت کا اندازہ ہو سکے۔

صحت عامہ:- صحت کا انھیں خیال سب سے زیادہ تھا۔ سب نہیں تو اکثر شفاخانے عورتوں نے بنوائے ہیں اور ان کے ساتھ بڑی بڑی جائدادیں وقف کی ہیں۔ ان میں سے بہترین "شفاخانہ غربا" اور "شفاخانہ نسا" ہیں۔ یہ دونوں ان اوقاف کی وجہ سے جو ان کے ساتھ کئے گئے تھے نہایت عمدہ اور مکمل حالت میں ہیں اور ان سے خلق خدا کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔

مجنونوں کی خبر گیری جو اعلیٰ تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی ہے، ترکی میں عورتوں کی ہمدردی اور خدا ترسی کی بدولت، بہت ترقی کر گئی ہے۔ سترھویں صدی میں جب یورپ والے اپنے یہاں کے مجنونوں کو تنگ جاکٹ میں جکڑ کر رکھتے تھے ترکی میں مہگنیسا کے مقام پر مجنونوں کا شفاخانہ موجود تھا ان کے ساتھ بہت مہربانی کا برتاؤ ہوتا تھا

اور موسیقی کے ذریعے ان کا علاج کیا جاتا تھا۔

کم سے کم ایک خاتون سترھویں صدی میں ایسی بھی تھی جو جیل خانوں کی اصلاح سے انتہائی دلچسپی رکھتی تھی یعنی ابراہیم کی ماں تُرخم سلطان۔ وہ ہر سال قید خانوں میں جاتی تھی اور جو لوگ قرض کی وجہ سے قید ہوتے تھے اُن کا قرضہ ادا کر کے انھیں رہا کر دیتی تھی۔ وہ خود قید خانے کے مہتمم سے گفتگو کرتی تھی اور طعام کا مغذات کا معائنہ کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے یقیناً قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہوگا اس کی فیاضی صرف قید خانوں ہی تک محدود نہ تھی وہ ہر سال بارہ لڑکوں اور لڑکیوں کو کسی پیشہ کی تعلیم دلاتی تھی اور انھیں کسی کام سے لگا دیتی تھی۔ ان لوگوں میں سے جنھیں وہ اپنی اولاد کی طرح پالتی تھی ہر سال بارہ کی شادیاں بھی کراتی تھی۔

عورتوں کے جاری کئے ہوئے بہت سے لنگر خانے بھی موجود ہیں جن کے ساتھ بڑے بڑے وقف ہیں۔ ان دنوں ترکی میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی ابتدا میں اس خیرات کی وجہ سے گداگری کو فروغ نہیں ہوا۔ کیونکہ جو شخص کام کر سکتا ہو اس کے لئے بھیک مانگنا بڑی ذلّت سمجھی جاتی تھی۔ میرے خیال میں جن ملکوں میں قحط یا بیکاری رہا کرتی ہو وہاں ان لنگر خانوں کا جاری کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر ان کا انتظام بہتر اصول پر ہونا چاہیئے۔

تعلیم: معاشرتی زندگی کے اس شعبے میں بھی عورتیں نہایت جوش اور انہماک سے کام کرتی تھیں۔ ترکی کے اکثر ابتدائی سکول ابتدا میں عورتوں ہی نے بڑی بڑی رقمیں دے کر

قائم کئے تھے۔ مسجدوں کے مکتب بھی زیادہ تر عورتوں ہی نے کھولے تھے۔ جن میں
اتنی مقدرت نہ تھی کہ مدرسے بنائیں۔ ان کا دستور تھا کہ اپنے محلے یا اپنی گلی کے چند غریب
بچوں کی تعلیم اپنے ذمے لے لیتی تھیں۔ میں نے عورتوں کی قائم کی ہوئی تعلیم گاہوں
کے نہایت دلچسپ وقف نامے دیکھے ہیں۔ ان میں صدقے، عطیے کا اعلان ہے، بہت پاکیزہ
شرائط ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقف کرنے والیاں بہت سمجھدار اور عاقبت اندیش
تھیں اور انھوں نے تعلیمی مسئلے کا بہت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ ان میں معائنے کی مدت
یہاں تک کہ غذا کی بھی تفصیل موجود ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کھیل کود
کھیلنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ بہت سے وقف ناموں میں شرط کر دی گئی ہے کہ
استاد بچوں کو پابندی کے ساتھ گاؤں کی سیر کرانے کو لے جایا کرے اور اس کے لئے
ایک رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔

ان کے علاوہ چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے غیر سرکاری مدرسے تھے
جن میں عورتیں تعلیم دیا کرتی تھیں۔ یہ اب سے تیس سال پہلے تک موجود تھے اور مسجد
کے مکتبوں سے بہت بہتر تھے۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کی عورتوں نے انہیں میں
تعلیم پائی تھی۔

عثمانی ترکوں کی تاریخ میں شاعرات اور انشاء پرداز عورتوں کے نام جس کثرت سے
نظر آتے ہیں اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوشحال گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم
پرانے طریقے کے مطابق بہت اہتمام سے ہوتی تھی۔

دورِ انحطاط میں ان مدرسوں میں بس یہی خرابی پیدا ہوگئی کہ انھوں نے زمانے کے تغیر کا اور ان نئے خیالات کا جو مغرب میں رواج پا رہے تھے لحاظ نہیں کیا۔

اس زمانے کی عورتوں خصوصاً ترکی عورتوں کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خود اعتمادی بہت کمی تھی جس کی وجہ سے حکومت کو ہر آن کے تغیروں اور ان سے نبٹنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے ایسے کئی فرمان موجود ہیں جن میں عورتوں کے لباس کے متعلق ہدایتیں دی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک محل سے باہر کی زیادہ تر عورتیں اتنا سخت پردہ نہیں کرتی تھیں جتنا سلطان چاہتا تھا مگر لباس کے متعلق جو قاعدے بنائے گئے تھے ان کی پابندی کبھی نہیں کرائی جا سکی۔ خود عبدالحمید بھی ہر رمضان میں ایک شاہی "ارادہ" (فرمان) جاری کیا کرتا تھا اور پولیس والے اس کے مطابق سڑکوں پر عورتوں کے لباس کی قطع و برید کرتے تھے۔ مگر یہ فرمان چند دن سے زیادہ نہیں چلتا تھا۔

انیسویں صدی کی ابتداء میں سلطان سلیم ثالث پہلا شخص تھا جسے حقوق نسواں کا حامی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی بہن خدیجہ سلطان عجیب وغریب صفات کی عورت تھی۔ اس نے عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کی اور انھیں جدید خیالات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ محل کی عورتیں اصلاح کی تحریک کی حامی بن گئیں مگر اس پر عمل اصل میں عہدِ تنظیمات میں شروع ہوا۔ نامق کمال خصوصاً اور اس کے حلقے کے لوگوں نے عموماً اس جوش و خروش کے ساتھ جو ان کا حصہ تھا عورتوں کی تعلیم اور ان کی معاشرتی

آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ اگرچہ ان لوگوں پر یقیناً کوندورسے اور دوسرے فرانسیسی انشا پردازوں کے خیالات کا اثر پڑا تھا وہ اس مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسلام نے عورت مرد سب کو اچھی طرح تعلیم دینے کی تاکید کی ہے۔ ان ہی لوگوں نے عورتوں کے مسئلے کو ادب کا موضوع بنایا کیونکہ اب تک قدیم ادب میں عورتوں کے ذکر سے پرہیز کیا جاتا تھا ارباب تنظیمات نے اس موضوع پر بہت شد و مد سے لکھنا شروع کیا خصوصاً عبدالحق حمید کے المیوں میں مسلمان عورتوں کا کیریکٹر بہت اہم ہے۔ اس کا یہ قول "ہر قوم کے تمدن کا معیار اس کی عورتوں کی حالت ہے" اب عورتوں کے ٹریننگ کالج کا اصول عمل ہے۔

۱۸۷۰ء میں حکومت نے عورتوں کو معلمی کی تربیت دینے کے لئے ایک نارمل اسکول اور لڑکیوں کے لئے ابتدائی مدرسے کھولے معلمات اب ریاست کی ملازم ہیں۔ ان مدرسوں میں زیادہ تر عوام کے بچے پڑھتے تھے اور معلمات بھی غریب طبقوں سے لی جاتی تھیں کیونکہ بدقسمتی سے امیر گھرانے کی عورتوں کی جدوجہد اپنے گھر کے کاموں تک محدود تھی۔ غیر ملکیوں کے مدرسوں کی تعداد بھی بڑھ گئی اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں غیر ملکی خصوصاً انگریز اتالیق عورتوں کا عام رواج ہو گیا۔ ترکی میں یہ بات لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی کہ انگریز عورتوں میں سنجیدگی اور مردانہ صفات پائی جاتی ہیں۔ اس لئے نئے زمانے کی عورتوں کے لئے انھیں کو نمونہ بنانا چاہئے۔

عبدالحمید کے زمانے میں انشاپردازوں کا ایک قابل قدر حلقہ تھا جس کی طرف

سے عورتوں کا ایک ہفتہ وار اخبار "دنیائے نسواں" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس نے بہت مفید خدمت انجام دی، اس لئے کہ اس کے خریدار عورتوں اور مردوں میں بہت کثرت سے تھے۔ اس کی ادارت تمام و کمال عورتوں کے ہاتھ میں تھی اب عورتیں صرف شاعر ہی نہیں ہوتی تھیں کہ عشق و محبت اور گل و بلبل کے نغموں سے دل بہلایا کریں بلکہ وہ نہایت غور سے معاشرتی اور تعلیمی مسائل کا جن کو عورتوں کی زندگی سے تعلق تھا مطالعہ کرتی تھیں۔

عورتوں کو حقیقی ترقی کا موقع ۱۹۰۸ء میں ملا۔ آئینی انقلاب کے بانی یعنی نوجوان ترک وہ لوگ تھے جو واقعی کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے۔ تعلیم پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے تھے۔ نوجوان ترکوں کی پارٹی پر اور جو اعتراض کیا جائے مگر تعلیم خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں انھوں نے بہت بڑا کام کیا۔ عورتوں کی نظر اور زندگی میں وسعت پیدا ہوگئی اور انھیں پوری طرح یہ احساس ہوگیا کہ نئی ترکی بغیر ان کے اتحاد و عمل کے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ خود عورتوں نے اپنی انجمنیں قائم کرنا شروع کیں۔ ان کے پہلے کلب تعلی نسواں نے ایک لکچروں کا سلسلہ جاری کیا جس میں مختلف علوم و فنون کے ماہر آکر لکچر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا مرکز پرورش اطفال کی تربیت دینے کے لئے قائم کیا گیا سارے استنبول میں بہت سی معاشرتی انجمنیں قائم کی گئیں ان میں سب سے مفید وہ انجمنیں تھیں جن میں معلم اور معلمات مل کر رات یا دن کے مدرسوں میں بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ تعلیم عورتوں کا اصول عمل بن گئی اور پہلی بار امیر

گھرانوں کی عورتوں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کیا۔ جب جنگ بلقان چھڑی اور اس کی وجہ سے ملک کی حالت بہت خراب ہوگئی تو احتجاج کے جلسے کرنے میں، زخمیوں کی خبرگیری میں، یتیموں بیواؤں اور بلقان کے پناہ گزینوں کے لئے دستکاری کی تعلیم کا انتظام کرنے میں، ترکی عورتوں نے کمال کر دیا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عوام کا نظریہ عورتوں کے متعلق بدلنے میں اس بات کو بہت دخل ہے کہ ترکی عورتوں نے اس جنگ کے دوران مجروح سپاہیوں کی خدمت میں جان لڑا دی۔

ادھر حکومت نے بھی بڑا کام کیا۔ اس نے ترکی کے پورے نظام تعلیم کو جدید طرز پر ڈھال دیا۔ اور عورتوں کو بھی مردوں کے برابر تعلیمی حقوق عطا کر دئے۔ نارمل سکولوں کی تعداد بڑھادی گئی اور ان میں نئے طریقے کی بہتر تعلیم دی جانے لگی۔ عورتوں کے کالج سارے ملک میں کھل گئے۔ استنبول کا زنانہ ٹریننگ کالج اس دور کی سب سے بہتر عمارت سمجھی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ کالج تعلیم اور انتظام کے لحاظ سے دنیا کے کسی کالج سے کم نہیں ہے۔ نوجوان ترکوں کی حکومت نے لڑکیوں کو یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۶ء سے ترکی میں بھی ان کا داخلہ یونیورسٹی میں ہونے لگا۔ ۱۹۱۱ء میں دو عورتوں نے ڈاکٹری کی سند لے کر پریکٹس شروع کر دی۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ایسی صورت پیش آئی کہ عورتوں کی خدمات اور قربانیوں کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا تھا۔ مرد سب کے سب میدان جنگ میں تھے باہر سے تجارت کی راہیں مسدود تھیں۔ اس سرے سے اس سرے تک عورتیں ہی ضرورت کی سب چیزیں

پیدا کرتی تھیں۔ فوجوں میں عورتوں کی پلٹنیں قائم کی گئیں جو محاذِ جنگ کے پیچھے کام کرتی تھیں۔ سپاہیوں کو خوراک اور لباس پہنچانا انھیں کے سپرد تھا۔ پھر ملکی محکموں میں بھی عورتوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ ۱۹۱۶ء تک عورتیں تعلیم اور تجربے میں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ انھیں ملک کے نظم و نسق میں دخل ہو گیا تھا۔

عام شہری زنانیوں کی تعلیمی خدمات اور گاؤں والیوں کی زراعتی خدمات سے زیادہ قابلِ قدر وہ کام ہے جو قصباتی عورتوں نے کیا۔ بال بچوں کی خبرگیری کا پورا بوجھ انھیں پر تھا۔ انھیں دوبارہ بیٹنا پڑا، سارے ملک میں پھر کر خرید و فروخت کرنی پڑی۔ خوردہ فروشی کی دکانیں کھولنی پڑیں کہ کسی طرح اپنے بچوں کا پیٹ بھریں۔ اگر عورتیں یہ زبردست خدمات انجام نہ دیتیں تو جنگ عظیم میں ترکی قوم کا گھر بیٹھ گیا ہوتا۔ ان سب کاموں میں ان قوم پرور انجمنوں نے جو ترکی اجاقی کہلاتی تھیں بہت بڑی مدد کی۔ یہ انجمنیں تعلیم یافتہ طبقے اور طلبہ نے قائم کی تھیں اور ان میں ہر قسم کے سیاسی خیال کے لوگ شامل تھے۔ ان انجمنوں میں پہلی بار ترک مردوں اور عورتوں نے مل کر قومی ضرورتوں اور ترقی کی صورتوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا۔

ان انجمنوں کی جد و جہد کا ذکر کرنے کے لئے ایک مستقل خطبے کی ضرورت ہے جس کی اس سلسلے میں گنجائش نہیں۔ ان کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم اور معاشرت میں عورتوں اور مردوں کی مساوات کو قومی اور مذہبی نقطۂ نظر سے تسلیم کر لیا۔ مذہبی حیثیت سے ایک حد تک یہ اصول عہدِ تنظیمات میں قبول کر لیا گیا تھا۔ اب قوقِ آلپ ضیا نے

جو اتحاد تورانی کا حامی، عمرانیات کا ماہر اور گویا نئی حکومت کا ذہنی رہنما تھا بڑے زور شور سے اس خیال کی اشاعت کی کہ قبل اسلامی عہد میں ترکوں نے عورتوں کو مساوات کا درجہ دے رکھا تھا اور یہی اس نسل کی عظمت اور استحکام کا راز ہے۔ اس کی ان کوششوں اور اس اثر کی بدولت جو وہ مصنف کی حیثیت سے اور نوجوان ترکوں کی مجلس مرکزی کے رکن کی حیثیت سے رکھتا تھا ۱۹۱۶ء میں ایک نئے قانون خاندان کا نفاذ ہوا۔ پرانا قانون بھی منسوخ نہیں کیا گیا۔ بلکہ عورتوں اور مردوں کو یہ حق دیا گیا کہ دونوں میں سے جس پر چاہیں عمل کریں۔ نیا قانون بھی لفظاً نہیں تو معناً اسلامی شریعت پر مبنی تھا اسلام میں نکاح ایک قسم کا باہمی معاہدہ ہے اور نئے قانون میں یہی اصول پیش نظر رکھا گیا تھا۔ عورت کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ خلع کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھے۔ مرد سے دوسری شادی نہ کرنے کا عہد لے لے، یا جو شرط چاہے نکاح نامے میں لکھوالے بہت سی عورتوں نے نئے قواعد کے مطابق نکاح کیا مگر زیادہ تر لوگ ایسے تھے جنھیں یہ قواعد پسند نہیں آئے۔ اصل میں ترکی عورتوں کو طلاق یا خلع کی سہولت کی خواہش نہیں تھی بلکہ وہ نکاح کو اور زیادہ مستحکم کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اسے انفرادی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ایک اہم اجتماعی مسئلے کی حیثیت سے دیکھتی تھیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ تعدد ازدواج کی ممانعت ہو جائے اور طلاق کا حق دولہا کی بجائے جماعت کو یعنی عدالت کو دے دیا جائے۔

یہ حالت تھی ترکی عورتوں کی ۱۹۱۸ء میں جب ماضی صلح کے ذریعے جنگ عظیم کا

خاتمہ ہوا۔ ان کی تحریک آزادی کی نشو و نما حسب ذیل خصوصیات رکھتی ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے مغرب کی تحریک نسوانی سے مختلف ہے (۱) اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ عورتوں نے مردوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کی ہو۔ یہ عام اصلاحی پروگرام کے ایک جزو کی حیثیت رکھتی تھی اور اس لئے اسے کل ترقی پسند پارٹیوں کی تائید حاصل تھی۔ خواہ اور باتوں میں ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس پر سب کے سب متفق تھے۔ (۲) خلاف اور اصلاحات کے اس میں مشرق و مغرب کی کش مکش کو بہت کم دخل تھا۔ عورتوں کو حقوق دینا شریعت اسلام اور قدیم ترکی روایات کی تجدید سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس تحریک کی قوت اتنی بڑھ گئی۔

البتہ ترکی عورتوں کی معاشی خدمات کا تعلق عالمگیر واقعات سے ہے۔ ان کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح تو نتیجہ ہے ان کوششوں کا جو بالقصد کی گئیں مگر ان کی معاشی جد و جہد کا دائرہ دنیا کی موجودہ حالت کے اثر سے جو جنگ عظیم کے بعد پیدا ہو گئی ہے خود بخود وسیع ہو گیا۔

اب میں بہت اختصار کے ساتھ یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ موجودہ جمہوری عہد میں عورتوں کی کیا حالت ہے۔

خواتین و حضرات!

اس قومی مصیبت نے جس کی انتہا یہ تھی کہ ۱۹۱۸ء میں استنبول پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ترکی عورتوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انھیں اب معلوم ہوا کہ وہ اپنے

ملک کو کس قدر عزیز رکھتی ہیں، اس کی یہ حالت دیکھ کر انھیں جس قدر صدمہ ہوا اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ جنگ بلقان کے زمانے سے وہ دل و جان سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف تھیں۔ اب یہ نظر آتا تھا کہ ان کی ساری قربانیاں رائگاں گئیں۔ قریب تھا کہ ان کی ہمت اور طاقت جواب دے دے مگر انھیں یہ احساس تھا کہ ملک عورتوں کے لئے گھر کی طرح ہے، وہ کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ساری قوم کا گھر ہے۔ عورتوں کا فرض ہے کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے اس گھر کی حفاظت کریں۔

سیاسی مجالس میں جوان عورتیں سیاہ لباس پہنے ہاتھ میں نوٹ بک لئے مردوں سے گفتگو کرتی نظر آتی تھیں کہ ملک کو اس تباہی سے کیسے بچائیں۔ عام معنوں میں احتجاجی جلسوں میں عورتیں ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتی تھیں اور ان میں صرف جوان اور تعلیم یافتہ خواتین ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ بڑھیاں بھی جو ہر قسم کی تبدیلی کو لغو سمجھتی تھیں۔ گاؤں والیاں شام کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر کاڑھتی جاتی تھیں اور ملکی معاملات پر گفتگو کرتی جاتی تھیں۔ صلح کی تمنا جس بے تابی سے عورتوں کو ہوتی ہے مردوں کو کبھی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ گھر بار کی سلامتی اور بچوں کی راحت و مسرت امن و صلح پر منحصر ہے مگر ترکی کی عورتیں جانتی تھیں کہ اس وقت اگر جان توڑ کر یا آخری مقابلہ نہ کیا جائے تو نہ گھر باقی رہے گا اور نہ ملک۔

پھر کیا تعجب ہے کہ ہم یہ سنتے ہیں کہ سمرنا کی پہاڑیوں میں اور سلیشیا کے میدان

میں عورتیں خود لڑتی تھیں یا لڑنے والوں کی مدد کرتی تھیں۔

جب انگورہ کی حکومت قائم ہوئی اور بے قاعدہ جتھے باقاعدہ فوج میں شامل کر لئے گئے تو عورتوں نے لڑنا چھوڑ دیا مگر پھر بھی بغیر ان کی مدد کے کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر شہر اور قصبے میں عورتوں نے "تحفظ حقوق قومی" کی انجمنیں قائم کر رکھی تھیں جو ہلال احمر کے کام میں اور دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ اہم خدمت وہ تھی جو کسانوں کی عورتوں نے انجام دی۔ اب کی بار انھوں نے کپڑے نہ جوتے بنے اور نہ ورثت کی کل چیزیں فراہم کرنے کا کام بغیر مردوں کی مدد کے انجام دیا۔ پھر وہ اس حیثیت سے کہ پاؤں میں جوتے اور بدن پر کافی کپڑے تک نہ تھے، سامان جنگ بیل پر لاد کر یا بیل گاڑیوں میں بھر کر اس سرے سے اس سرے تک ملک میں پھرتی تھیں۔

بعض خدمات جبری تھیں۔ مگر رضاکاروں کی ایک بہت بڑی جماعت تھی، جو بہت سے کام اپنی خوشی سے انجام دیتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ یہ دیکھا کہ باربرداری کی گاڑیاں چلی جا رہی ہیں جن کی ہنکانے والیاں سب کی سب عورتیں ہیں ان کی افسر سارجنٹ فاطمہ ایک ستر برس کی عورت، تیر کی طرح سیدھی، فولاد کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اپنے پوتے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی جو گونگا اور اندھا تھا۔ ہانکنے والیوں میں سے ایک حاملہ تھی۔ یہ عورتیں خاموشی اور وقار کے ساتھ اپنی گاڑیوں کو لئے نہ صرف کیچڑ اور دلدل میں بلکہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

کوئی ملک خواہ اس کے مرد کتنے ہی جانباز اور بہادر کیوں نہ ہوں ایسی صورت میں جو ترکی کو ۱۹۱۸ء میں پیش آئی تھی، اپنی آزادی کو ہرگز قائم نہیں رکھ سکتا جب تک اس کی عورتوں کے دل ان جذبات سے معمور نہ ہوں جن سے ریاستیں وجود میں آتی ہیں۔ میں نے سمرنا میں یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے کھنڈروں میں ایک بوڑھی عورت دیکھی جو جنگ بلقان سے اب تک پانچ بار ترک وطن کر چکی تھی۔ کیونکہ اُسے کسی غیر قوم کے جھنڈے کے نیچے جان دینا گوارا نہ تھا بھلا ایک سُرخ کپڑے کی دھجی میں جس پر ہلال کی شکل ہی ہو کیا رکھا ہے؟ بات یہ ہے کہ وہ نشانی ہے قومی زندگی کی اور قومی زندگی ترک کے لئے جان سے بڑھ کر ہے۔ اس طرح ہزارہا مثالیں ہیں جنھیں میں یہاں بیان نہیں کر سکتی۔ فکرت نے کہا ہے "ملک بہادروں کے کندھوں پر بلند ہوتا ہے" جمہوریت کی بھی اپنے جانباز بیٹوں اور بیٹیوں کے کندھوں پر بلند ہوا۔ عورتوں کی قابل قدر خدمات کے متعلق میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔ مادی حیثیت سے یہ خدمات کتنی ہی بڑی ہوں۔ اخلاقی حیثیت سے اس سے بھی بڑھ کر تھیں۔ ایک بار میدان میں قدم رکھنے کے بعد میں نے کسی عورت کو جھجکتے نہیں دیکھا۔ ان کے عزم و استقلال کا اس معرکے میں بڑا زبردست اخلاقی اثر پڑا۔

جمہوری عہد لوزان کانفرنس کے بعد جمہوری حکومت نے اصلاح کا کام شروع کیا۔ عورتوں کے متعلق حسب ذیل اصلاحات عمل میں آئیں۔ ان کی تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں صرف تین عورتیں ڈاکٹر تھیں اب ان کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے

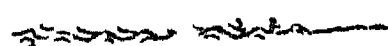
اسپتالوں کے انتظامی صیغوں اور حفظان صحت کے محکمے میں ان کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ترکی اور دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والی عورتوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا ہے اور استنبول کی یونیورسٹی میں کئی خواتین اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ تمام سرکاری محکموں میں کثرت سے عورتیں نوکر رکھی جاتی ہیں۔ قانون سے انھیں خاص شغف ہے اور نہ صرف دارالسلطنت میں بلکہ صوبوں کی عدالتوں میں بھی وہ ججی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ پولس میں بھی عورتیں اچھے اچھے عہدوں پر مامور ہیں۔ ہر شخص اس کو ان تغیرات کا قدرتی نتیجہ سمجھتا ہے جو عہد سلیمان سے برابر جاری ہیں اور جن کی رفتار ۱۹۰۸ء سے زیادہ تیز ہوگئی ہے

جمہوری حکومت میں عورتوں کے متعلق دو اہم قانون نافذ ہوئے ہیں (۱) نیا قانون دیوانی جس کے ذریعے سے تعدد ازدواج کی ممانعت ہوگئی ہے۔ وراثت میں لڑکوں اور لڑکیوں کا حصہ مساوی قرار دیا گیا ہے اور طلاق کا اختیار عدالت کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے۔ یہ سوئٹزرلینڈ کے قانون دیوانی کی نقل ہے (۲) وہ قانون جس کی رو سے عورتوں کو بلدی انتخابات میں حق رائے دہندگی اور کونسلوں کی رکنیت کا حق دیا گیا ہے۔ صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں عورتیں بلدیوں (منوسپلٹیوں) کی ممبر ہیں۔ یہ چیز سیاسی کونسلوں کی رکنیت سے زیادہ اہم ہے اس لئے کہ بلدیتے گویا شہر کے گھریلو کام انجام دیتے ہیں اور شہر خود ایک بڑا گھر ہے۔ عورتیں اس کی حفظان صحت اور آرائش وغیرہ کی نگرانی زیادہ وسیع نظر سے اور بہتر طریقے سے کرسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ

انھیں تھوڑے دن میں مجالس وضع قانون کے انتخاب میں رائے دینے کا اور ان کی رکنیت کا حق مل جائے گا۔ لیکن اگر یہ نہ بھی ہوا تب بھی اس سے کوئی ہرج نہ ہوگا ۞



لہ فروری میں اس خطبے کے پڑھے جانے سے پہلے ہی [illegible] حکومت نے عورتوں کو یہ حقوق عطا کر دیئے۔ حالانکہ [illegible] ہو کر اس کا ذکر کیا تھا لیکن مسودے میں یہ عبارت [illegible] ترتیب نہیں بدلی۔ ہم نے بجنسہٖ اس کا ترجمہ کر دینا مناسب سمجھا ۞



آٹھواں خطبہ

خواتین و حضرات!

میرے لئے فخر و مسرت کا باعث ہے کہ میرے جتنے لکچر جامعہ ملیہ میں ہوئے اُن کی صدارت ایسے بزرگوں نے کی جو ہندوستان میں سب سے ممتاز اور محبوب ہیں۔ یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ اس آخری خطبے کے صدر ڈاکٹر بھگوان داس ہیں۔ آپ نے مغرب اور مشرق کی کش مکش کے مسئلے کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر بہت قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ میں آج کی تقریر میں ان کی جدید تصنیف کے جس کا نام "مذاہب عالم کا اصول اتحاد" ہے کئی اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں گی۔ میرے خیال میں سب مسلم ہندو اور دوسرے مشرقی علماء کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ ہم سب کے روحانی عقائد میں بڑی حد تک مشابہت ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر مغربی عالم کو بھی چاہئے کہ مشرق کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اسے پڑھ لے۔ تاکہ اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ مغرب کی روحانی نشو و نما میں مشرق کو کس حد تک دخل رہا

میں ڈاکٹر بھگوان داس کا اور اُن سب بزرگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے میرے لکچروں کی صدارت فرما کر میری عزّت افزائی کی۔

خواتین وحضرات،

ان سات تقریروں میں جو میں آپ کے سامنے کر چکی ہوں میں نے ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش دکھائی ہے۔ اس وقت تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر ابھی تک ترکوں کے دل میں سطح کے نیچے مشرقیت کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اس میں شک نہیں کہ اس جذبہ کو مٹانے کی زبردست کوششیں کی گئیں لیکن مٹتے مٹانے کے بعد جو کچھ بچ رہا ہے اسے اس جذبے کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ کوئی تعجب نہیں کہ جب مشرقی جذبے کو ترکوں کے دل میں آزادی سے نشو ونما پانے کا موقع ملے تو مشرق ادنیٰ میں مشرق ومغرب کی کش مکش کا مسئلہ اس طرح حل ہو جائے کہ دنیا کے لئے ایک نمونے کا کام دے یعنی کش مکش امتزاج کی صورت اختیار کرے۔

اس وقت میں یہ چاہتی ہوں کہ نفس انسانی کی ان دونوں کیفیتوں پر جن میں یہ کش مکش جاری ہے یعنی مادّیت اور روحانیت پر اور ایک نظر ڈالوں۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں نے جو تعریف مشرق اور مغرب کی سیدھے سادے الفاظ میں کی تھی اس پر تحریر اور تقریر میں تنقید کی گئی ہے۔ انسانی دنیا میں جتنے اختلافات آج تک ہوتے رہے ہیں ان میں روح اور مادّے کی کش مکش ایک دائمی چیز رہی ہے۔

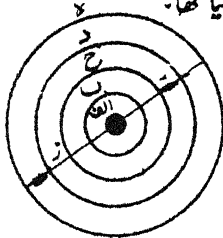
اور نت نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے اس لئے اس مسئلے کی جتنی چھان بین کی جائے کم ہے۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے مادیت کو مغربی تمدن کی خصوصیت قرار دے کر مغرب کے ساتھ بے انصافی کی ہے وہ میری تردید میں ان عظیم الشان معاشرتی خدمات کی مثالیں پیش کرتے ہیں جو مغرب کے مردوں اور عورتوں نے انجام دی ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور پھر کہتی ہوں کہ مادیت کے فلسفے کا خود غرضی پر مبنی ہونا ضروری نہیں وہ تو ایک عقیدہ ہے جس میں مادی دنیا کی ترقی اور انسان کی مادی ضروریات پر زور دیا جاتا ہے اور یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس کا ایک علیحدہ ضابطہ اخلاق ہے جس میں انسانوں کے عمل اور ان کے باہمی تعلقات کے اصول سختی کے ساتھ متعین کر دیئے گئے ہیں

ان محترم بزرگوں کے علاوہ سر محمد اقبال نے بھی سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مشرق اور مغرب کی تعریف پر اعتراض کیا ہے۔ انہوں نے نہایت قابلیت سے اس مسئلے پر بحث کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ [illegible] میں آپ کے ان اعتراضات کا جو مشرق اور مغرب کے متعلق ہیں۔ پھر کسی وقت علیحدہ علیحدہ جواب دوں گی۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ مغرب کا مادی پہلو پر زور دینا خواہ تعریف کی حیثیت سے ناقص ہو مگر ایک امر واقعہ ہے جسے اکثر مغربی علما تسلیم کر چکے ہوں

سر اقبال فرماتے ہیں کہ افلاطون یورپ کا پہلا فلسفی ہے جس نے روح محض کا تصور قائم کیا اور اس کا اثر مشرق اور مغرب دونوں پر پڑا۔ یہ سچ ہے لیکن اس سے ہمارے اس قول کی جو واقعے پر مبنی ہے تردید نہیں ہوتی کہ مغرب کی موجودہ تہذیب مادی تہذیب ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کے نظریات کی نشوونما کے مختلف دور کیا تھے ہم اس وقت ان کے نتائج کو دیکھتے ہیں۔

میں موجودہ مغربی تمدن کی تنقید میں ایک جرمن عالم ڈاکٹر ہاس کے خیالات سے مدد لیتی ہوں انھوں نے جنیوا میں تین لکچر دیئے تھے جن کا عنوان تھا "مغربی تمدن کیا چیز ہے" اب یہ لکچر ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ہاس کا انتخاب میں نے اس وجہ سے کیا کہ وہ اُن مغربی علماء میں سے ہیں جو مغربی تمدن پر مشرق کے اثر کو تسلیم نہیں کرتے انھیں اس پر فخر ہے کہ مغرب کا تمدن بالکل جداگانہ اور مستقل حیثیت رکھتا ہے مگر وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے نتائج اچھے نہیں ہیں انھوں نے اس تمدن کی مختلف منزلیں قرار دی ہیں اور یہ وہی ہیں جو عام طور پر تاریخ میں دکھائی جاتی ہیں۔ ان کو بھی اسی قسم کے ایک نقشے سے ظاہر کروں گی جس سے میں نے پہلے خطبے میں کام لیا تھا۔



الف:- قدیم یونان موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا۔ اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کی ہم آہنگ نشو و نما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے جسمانی تربیت۔ ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ذہنی تعلیم جو شاعری۔ موسیقی۔ ڈراما فلسفہ۔ سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہونچنے پائے۔ یونان کے مذہب میں۔ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا۔ علم دین ہے نہ پیشہ ایمان دین کا طبقہ۔ آرفیس وغیرہ کے ۔۔۔ م میں جو باطنی رنگ پایا جاتا ہے اسے ڈاکٹر ہاس نے مشرقی قرار دے کر یونان کے تمدن سے خارج کر دیا ہے۔

ب:- رومہ فرد کی جسمانی اور ذہنی تربیت کے بعد مغرب نے معاشرت اور ریاست کی تعمیر کی طرف توجہ کی اس نے انسانوں کے ہر قسم کے باہمی تعلقات کا تعین کر دیا مگر اس پر وہی مادیت کا رنگ غالب رہا اور دنیاوی زندگی پر اسی طرح زور دیا جاتا رہا۔

ج مسیحیت اس کے بعد وہ دور آیا جب مغرب کی توجہ محسوس مادی اشیا سے ہٹ کر غیر محسوس روحانی زندگی کی طرف ہو گئی۔ ہم بے تکلف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسیحیت کا ابتدائی عہد رہبانیت مشرقی اثرات کا نتیجہ ہے۔ گو "مغربی تمدن کیا ہے" کا مصنف اس سے متفق نہیں ہے۔ وہ مغربی ذہن کی ایک خصوصیت کی توجہ دلاتا ہے جو بار بار ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کے خیال میں قرون وسطےٰ کا فلسفہ اور عقیدہ اسمائیت

مبنی ہے۔ اہل مغرب ما فوق فطرت چیزوں کا تصور جسمانی رنگ میں کرتے ہیں "عیسائیوں کے جتنے نظریات اپنی مذہبی رسوم کے متعلق ہیں اُن میں روحانی حقائق کو سمجھانے کے لئے بظاہر جسمانی استعاروں سے کام لیا گیا ہے" اس لئے مصنف اسے تسلیم نہیں کرتا کہ مغرب کی بہ نسبت شرقی پستی ہے وہ کہتا ہے کہ چاہے اس کی ابتدا کچھ ہی ہو اب تو اس نے مغربی رنگ اختیار کر لیا ہے

د۔ مطالعہ فطرت | ڈاکٹر راس کے نزدیک مغربی ذہن بالکل بے غرضی اور خالص عین پرستی سے علم صحیح کی تلاش کرتا ہے وہ فطرت کا مطالعہ محض ریاضیاتی اور عقلی نقطۂ نظر سے کرتا ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ اس کا روحانی اور معنوی پہلو نظر انداز کر دیا جائے یہ ایک بہت بڑی قربانی تھی کیونکہ جب انسان کے ذہن میں فطرت کا تصور یہ ہو کہ وہ سراسر مادی ہے جو روح نہیں رکھتا ہے نہ کوئی مقصد تو وہ اپنی ذات کو بھی روح سے خالی سمجھنے لگتا ہے مگر یہ قربانی اس وقت مغربی ذہن کو کرنی ضروری تھی ڈاکٹر راس کے خیال میں [illegible] کے ابتدائی زمانے میں مغربی ذہن نے جو [illegible] اختیار کیا [illegible] وغیرہ [illegible] کی وہ کوئی مثال نظر نہیں آتی

ہ۔ نتائج | [illegible] فطرت [illegible] مطالعہ [illegible] اُن کے سب [illegible] کی ہالیا ہے [illegible] زندگی کا ایک [illegible]

لہ [illegible] ایک [illegible] نے اسے مغربی [illegible] اسلام [illegible] پر [illegible] اسے مشرقی سانچے میں ڈھال لیا ہے۔

تصور پیدا ہو گیا۔ روح کی حقیقت سمجھی جانے لگی کہ یہ محض احساسات اور ادراکات کا مجموعہ ہے جو علت و معلول کے قانون کے مطابق مجتمع اور منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ جب فطرت روح سے خالی ٹھہری تو زندگی کا کوئی مقصد بھی نہیں رہا۔ (۲) تاریخ کی تفسیر مادی نقطۂ نظر سے ہونے لگی اور اس کی توجیہہ معاشی اغراض سے کی جانے لگی مذہب اور دوسری روحانی اور اخلاقی قدروں کو لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ مادی اغراض کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ (۳) مغربی ذہن انسان کی تخلیقی قوت کا قائل نہیں رہا وہ ابتدائی عہد کے حکما کی معلومات اور انکشافات کے طفیل میں فطرت پر حکومت کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی تخلیقی قوت پر بھروسا باقی نہیں۔ (۴) ان چیزوں کے سبب سے بعض مغربی علما خصوصاً جرمنی کے حکما کو مغربی تمدن کی طرف سے مایوسی پیدا ہو گئی۔ ان کے نزدیک مغربی تمدن کو جو کچھ کرنا تھا کر چکا اب اس کا خاتمہ ہے۔

(۵) مغربی تمدن کے ان تمام پہلوؤں میں ایک چیز سب سے نمایاں اور سب پر حاوی ہے اور وہ مغربی ذہن کی قوت تنظیم ہے۔

"مغربی تمدن کیا ہے"، کا مصنف اس نقطے کو پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ مغربی ذہن کی قوت تخلیق کا ہرگز خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی یہ پیش گوئی ہے کہ مغربی ذہن انسان معاشرت اور سلطنت کی تنظیم کے مراحل طے کرنے کے بعد اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا اور پھر انسان سے شروع کر کے اس نقطے کے کل دائرے از سر نو ایک کر کے بنائے گا۔

ممکن ہے کوئی مشرقی عالم پوچھے یہ نئے دائرے کس قسم کے ہوں گے؟ مغربی ذہن کی قوت تعلیم اپنے اظہار کا کون سا نیا طریقہ اختیار کرے گی کیا وہ پھر مادی قدروں کو ایسا معیار بنائے گی یا غیر محسوس روحانی قدروں کو پیش نظر رکھے گی مغرب میں جو ذہن برسرکار ہیں وہ اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ مغربی دنیا کے مستقبل کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بہرحال ہم مغربی حالات کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش اور ان کے نتائج کے متعلق کچھ قیاس آرائی کریں گے۔

ہم زندگی کے دو شعبوں کو اپنے مطالعے کا موضوع قرار دیتے ہیں۔

اس صدی کے نئے علمی انکشافات | یہ انکشافات انیسویں صدی کی مادیت اور قدرتیت کو رفتہ رفتہ باطل کر رہے ہیں اب کوئی فلسفی دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی زندہ جسم کے تغیرات محض طبیعی اور کیمیاوی عمل کے نتائج ہیں اب سائنس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد نہیں رہا ہے اس کی اقلیم میں نامعلوم اور غیر محسوس عناصر کا دخل ہوتا جاتا ہے۔ اس عقیدے کے لئے کافی گنجائش نکل آئی ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والی ایک غیر محسوس قوت ہے اس لئے ایشیا کے مذاہب اور فلسفہ نقطۂ نظر سے دوبارہ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے جس سے سائنس دانوں کے خیالات میں باطنیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

مغرب کے عام لوگوں کا رجحان بھی روحانیت کی طرف صاف معلوم ہوتا ہے اینگلو سیکسن ممالک میں نئے اشتہاری مذہبوں کا رواج ہے۔ پرانے مذاہب کا تسلط بھی

بڑھ رہا ہے۔ فرانس میں تو رُو کے زائروں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اور تھیٹر کی بہت سی اکٹرسیس خانقاہوں میں داخل ہو رہی ہیں اور تو اور شیطان کے پوجنے والے اور سفلی جادو کے ماننے والے بھی بہت ہو گئے ہیں[1]۔

ان آثار کو دیکھ کر قیاس یہ کہتا ہے کہ مغرب میں روحانیت زندہ ہونے والی ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ مغربی ذہن اب نفس انسانی کی تہذیب و تربیت کا کیا طریقہ

---

[1] روح اور روحانیات کے انکار کی وجہ سے فنون لطیفہ کو جو شدید نقصان پہنچا ہے اس کا ذکر بہت سے ارباب فن اور ارباب نظر کی تصانیف میں موجود ہے۔ زمانہ حال کا ادب اس کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں ایک نوجوان فرانسیسی ڈراما نویس ہرماں گرگوار کی کتاب "دہریت کا آرٹ یا اصنام باطل" سے ایک عبارت نقل کرتی ہوں جو میرے خیال میں بہت لطیف ہے اور جس سے اس طرز خیال کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

"روح اور ایمان نہ ہو تو آرٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے زمانے میں صناع تو پیدا ہوتے ہیں مگر ان کے سر کوئی کلاہ نہیں ہے۔ جب یہ اساس اور رابطہ نہ رہے تو تمام چیزیں بے اصول بے راہ ہو جاتی ہیں۔ فسیح چیزیں حسیں بن جاتی ہیں۔ بدی نیکی بن جاتی ہے۔ لذت کوفت ہو جاتی ہے۔ حیف اس دنیا پر جو روح سے خالی ہے!

عصر حاضر کے ڈراما نویس کی یہ عجیب ادائے خاص ہے کہ اس نے ہمارے زمانے کی کامیڈی میں چلتی پھرتی لاشوں کو ایکٹر بنا دیا"

اختیار کرے گا۔ ہم مشہور ماہر برقیات اسٹائن ماز کا قول پیش کر سکتے ہیں ان سے ایک بڑے سرمایہ دار روجر بابسن نے پوچھا کہ آئندہ پچاس سال میں کس شعبے میں سب سے زیادہ علمی تحقیقات ہونے کی امید ہے بجائے اس کے کہ وہ برقیات کی کسی شاخ کا نام لیتے انھوں نے کہا کہ سب سے اہم انکشافات روحانی زندگی میں ہوں گے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی اہمیت ہمیں تاریخ میں صاف نظر آتی ہے۔ یہی انسان کی نشوونما اور تاریخ کی ارتقا میں سب سے بڑی قوت ثابت ہوئی ہے لیکن ہم نے اب تک اس کی طرف محض برائے نام توجہ کی اور جس اہتمام سے طبعی قوتوں کا مطالعہ کیا اس کا کبھی نہیں کیا۔ ایک دن لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مادی چیزوں سے راحت حاصل نہیں ہوتی اور وہ انسانوں کو قوی اور خلاق بنانے میں کام نہیں آتیں۔ تب تمام دنیا کے سائنس داں اپنے معملوں میں خدا کی جستجو۔ عبادت کی تحقیق اور ان روحانی قوتوں کے مطالعے میں وقف کریں گے جنھیں ہم نے اب تک ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ جب یہ دن آئے گا تو دنیا ایک نسل میں اتنی ترقی کرے گی جتنی پچھلے چار قرنوں میں نہیں کر پائی ہے

اگرچہ سائنس۔ فلسفے اور آرٹ کی دنیا میں بلکہ عوام کے اندر بھی یہ رجحان صاف نظر آتا ہے کہ آئندہ زندگی کی بنیاد روحانیت پر رکھی جائے مگر یہ کوئی یقینی بات نہیں کہ مغرب میں یہ تبدیلی جلد عمل میں آئے گی۔ اس لئے کہ فلسفیانہ خیالات کا اثر انسان کے عمل کی تشکیل پر ایسی جلدی ہی نہیں پڑتا۔ اگرچہ کبھی نہ کبھی پڑتا ضرور ہے۔ علاوہ روحانی قوت

کہ جسے سائنس کی تائید حاصل ہے ہمیں مغرب میں اور قوتیں بھی کارفرما نظر آتی ہیں۔
ان کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں زندگی کے دوسرے شعبوں پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

۴۔ معاشی اور سیاسی تحریکیں:

ان میں ابھی تک وہی قوتیں کام کررہی ہیں جو انیسویں صدی کی مادیت سے پیدا
ہوئی تھیں پُرانے سیاست دان ابھی اسی طرح سرمایہ داروں کے قبضے میں ہیں جس
طرح جنگ عظیم سے پہلے تھے وہ بالکل مادیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اُن کے
حریف اور سرمایہ داروں کے دشمن یعنی اشتراکی سیاست داں بھی مادیت پرست ہیں۔
گو اُن کی یہ کوشش کہ سرمایہ داری کی خرابیوں کو دور کرکے دولت کی تقسیم مساوی طور پر
کریں قابل تعریف ہے لیکن وہ روحانی قوتوں کی طرف سے اس قدر بے پروا بلکہ ان کے
اس قدر دشمن ہیں کہ ہر عقیدہ کو جو محسوسات سے تعلق نہ رکھتی ہو مٹانے کے درپے ہیں
کیا مغرب مادیت کا اور بھی گہرا رنگ اختیار کرے گا یا روحانیت کی طرف مائل ہوجائے گا؟
یہی سوال مغرب کی آئندہ تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس بات کا
فیصلہ کرنے کے لئے کہ مادیت اور روحانیت کی نزاع جاری رہے گی یا ان میں مصالحت
کا کوئی امکان ہے ہمیں ایک نظر مشرق پر اور ان قوتوں پر بھی ڈالنا چاہیے جو وہاں
کارفرما ہیں میں نے مشرقی تہذیب کی جو سیدھی سادھی تعریف کی تھی کہ اس کی
خصوصیت روح پر جسم سے زیادہ زور دینا ہے" اس پر کئی قسم کے اعتراضات کیے گئے
کئی ہندو اور مسلمان تعلیم یافتہ حضرات نے قریب قریب انھیں الفاظ میں مجھ سے کہا۔

ہم میں حقیقی روحانیت نہیں ہے یہ تو ایک وضع ہے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے ہم ہر وقت مذہب کا نام رٹا کرتے ہیں لیکن ہمارا مذہب ظاہر داری کے سوا کچھ نہیں ہندو مسلمان دونوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مذہب کا ڈھونگ بناتے ہیں۔"

سر محمد اقبال اسے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ مشرقی کے فلسفے کی بنیاد خاص روحانیت پر ہے۔ مثال میں وہ قدیم ایرانی شاعران کو پیش کرتے ہیں جو دوئی کا قائل تھا اور گوتم بدھ کہ جو جوہر روح کا سرے سے منکر تھا[ملہ]۔ لیکن ہمیں تو ان دونوں تہذیبوں کے آخری نتائج سے بحث ہے جواب ہمارے سامنے موجود ہیں مشرقی تمدنوں کی موجودہ صورت یہی ہے کہ وہ (بعض خودی چیزوں کو مستثنٰے کر کے) مادی زندگی کی معقول سمجھ سے قاصر ہیں۔

(زمین اور معاشی وسائل) میں جو حصہ ان کا تھا اسے بھی کھو بیٹھے ہیں اور اہلِ مغرب

ملہ ڈاکٹر بھگوان داس جی کی میرے دل میں بڑی قدر اور عظمت ہے ایک خط میں جو انھوں نے میرے ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے ہی بھیجا فرماتے ہیں کہ آپ نے جامعہ ... کے لیکچروں میں ... حال ... کیا تھا کہ مشرق نے روحانیت کے شوق میں مادی چیزوں کی طرف کافی توجہ نہیں کی اس میں شک نہیں کہ آخر کی چند صدیوں کے متعلق یہ بات صحیح ہے لیکن یہ سوال ... اس کا اطلاق ... نہیں ہو سکتا جب معاشرتی نظم کے ان اصولوں پر واقعی عمل ہوتا تھا جو نون کی تحت تدبیر امور سری ہیں بیان کئے گئے ہیں۔

نہ صرف معیشت کے مالک ہیں بلکہ مشرق میں بھی انہیں کا ڈنکا بجتا ہے رہی یہ دلیل جو اکثر پیش کی جاتی ہے کہ ہندو کاروبار میں بہت ہوشیار ہیں بالکل خارج از بحث ہے اس لئے کہ روحانیت کے پیرو بھی مجرد ارواح نہیں ہیں آخر کسی نہ کسی طرح انھیں اپنا پیٹ پالنا ہی پڑتا ہے۔

اب ہمیں مشرق پر بھی اسی طرح شروع سے نظر ڈالنی چاہئے جیسے ہم ابھی مغرب پر ڈال چکے ہیں پہلا سوال یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کا مرکز کیا ہے؟ اگرچہ میں نے اپنے آٹھویں لیکچر کو جواب سے دو مہینے پہلے پیرس میں لکھا تھا بالکل بدل ڈالا ہے مگر یہ چند سطریں میں اسی میں سے نقل کرتی ہوں جن میں مغربی تمدنوں کے مرکز اور نقطۂ آغاز کا ذکر ہے۔

ہم نے دیکھا کہ مغربی ذہن کا جوہر اصلی قدیم یونانی تہذیب ہے جس نے اپنا مظہر جسم انسانی کو قرار دیا تھا۔ مشرقی ذہن کا جوہر اصلی قدیم ہندی تہذیب ہے اس لئے کہ اور کوئی مشرقی تہذیب ایسی نہیں جس میں مادیت کا جزو شامل نہ ہو۔ یہ صرف ہندوؤں کے ذہن کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی توجہ خالص روحانی عناصر تک محدود رکھتا ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح مغرب میں قوانین فطرت دریافت کئے جاتے ہیں اور اُن سے انسان کی فلاح و بہبود کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح روحانی قوانین بھی دریافت کئے جائیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو اُن کی کنجی ہندو ذہن کے ہاتھ میں ہے"

مجھے یہ خوشی ہے کہ کم سے کم اس بات میں سر محمد اقبال بھی مجھ سے اتفاق کریں گے اس لیے کہ وہ خود فرماتے ہیں "قدیم ہند کے خیالات کی پوری عمارت روح مجرد کے تصور پر قائم کی گئی تھی۔"

مجھے اس مسئلے میں مہاتما گاندھی سے بھی گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ ہندوؤں کے ہاں روح پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے مگر اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ لوگ ہندوؤں کی قدیم کتابوں کی تفسیر غلط کرتے ہیں اس کا جواب میں آگے چل کر دوں گی اس سے پہلے یہ دکھانے کے لیے کہ روحانیت پر زور دینا تمام اہل مشرق کی خصوصیت ہے جن میں ہندو مسلمان پارسی سب ہی شامل ہیں۔ میں ڈاکٹر بھگوان داس کی کتاب "مذاہب عالم کا اصولی اتحاد" سے چند ٹکڑے نقل کرتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ تمام مذاہب مشرق ہی میں پیدا ہوئے ڈاکٹر بھگوان داس نے ان میں سے اکثر مذاہب کی کتابوں سے ایک ہی مضمون کے اقتباسات جمع کیے ہیں۔

حق کا پیغام پہنچانے والے اور اسے مطلب کے مختلف پیرائے اختیار کرتے ہیں مگر اسی ایک حقیقت کا جلوہ ان سب میں نظر آتا ہے۔ "[illegible]

"نام مختلف ہیں تو کیا ہوا

"حقیقت تو ایک ہی ہے

"سمندر کی ہر موج [illegible] اور ہر بلبلے میں

"اسی ایک سورج کا نور جلوہ گر ہے"

(صوفی)

"دنیا میں ہر جگہ انسان الگ الگ راہوں پر چلتے ہیں مگر منزل سب کی ایک ہی ہے اور وہ منزل میں ہوں۔ ہستی مطلق شعور ذات خویش"۔

(گیتا)

مولانا روم کی تعلیم کا ایک اہم جزو جو کلام پاک کے الفاظ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سے ماخوذ ہے اسی مضمون کا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا۔

اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی۔

یہی بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے

وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ

اور ہر ایک قوم کے لئے رہنما ہوا کرتا ہے۔

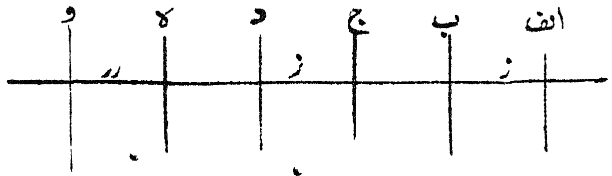
لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ

ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

یہی آیت پانچویں جیسے میں انجیل کے بانی یسوع مسیح کے ذکر کے سلسلے میں نقل کی جا چکی ہے۔ یسوع نے رکی؟ معاشی زندگی کا منظم روحانیت کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ

آیت مشہور و معروف میلاد نامے کے مصنف سلیمان دوہ کی زندگی کے اہم واقعے سے متعلق ہے وہ جامع بروصہ میں درس دے رہا تھا جس کے سلسلے میں اس نے یہ آیت پڑھی۔ ایک متعصب ایرانی مسلمان نے اس پہ اعتراض کیا اور اُسے کافر قرار دیا۔ بروصہ کے مسلمانوں نے سلیمان دوہ کی حمایت کی وہ ایرانی مصر اور حلب پہنچا اور وہاں کے علما سے سلیمان کی تکفیر کے فتوے لایا مگر اہل بروصہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آخر اس شخص نے خود ہی سلیمان کو راہ چلتے قتل کر دیا۔

ان سب اقتباسات سے اہل مشرق کے خیالات کا اتحاد ظاہر ہوتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان سب کے یہاں روحانیت پر زور دیا گیا ہے البتہ اس کے مدارج میں فرق ہے سب سے زیادہ مبالغہ اس میں ہندوؤں نے کیا تھا اس لئے ہم روح پر حد سے زیادہ زور دینے کو مشرقی تہذیب کی بنیاد قرار دے کر اس کی نشو ونما کی مختلف منزلوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر یہ بات قابل غور ہے کہ ان منزلوں کو ہم اس قسم کے نقشے سے ظاہر نہیں کر سکتے جس کے ذریعے سے ہم نے مغربی تہذیب کی نشو ونما دکھائی ہے۔ بات یہ ہے کہ مشرق کے تمدنوں میں وہ تسلسل نہیں تھا جو مغرب میں تھا کہ پہلے ایک تمدن آیا اور اس نے زندگی کے ایک شعبے پر زور دیا پھر دوسرا آیا اور اُس نے دوسرے شعبے پر زور دیا جیسے یونان روما اور مسیحی یورپ مشرق کے تمدن متوازی خطوط سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں جن میں کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا مگر سب الگ الگ ہیں البتہ روحانیت پر حد سے زیادہ زور دینا ان سب میں مشترک ہے۔



الف، ب، ج، د، ہ، و مختلف مشرقی تمدنوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مشرق کا ہر تمدن ایک خاص حصے میں پیدا ہوا اور وہیں ختم ہو گیا اس طرح کہ اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ جتنے تمدن اب موجود ہیں ان سب میں سے ایک خط (ز) گذرتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مادی زندگی کی مستحکم اور پائدار سطح نہ کر سکنا ان سب کی مشترک خصوصیت ہے اگر آپ (ز) کی کوئی اور تعبیر کر سکتے تو مہربانی کر کے ضرور کیجئے۔

موجودہ حالت میں یہ سب تمدن اپنے مادی مسائل کو منظم طریقے پر حل کرنے سے قاصر ہیں جس طرح مغرب کے لئے (خصوصاً پچھلی صدی میں) مادے پر حد سے زیادہ زور دینا اب مہلک ثابت ہو رہا ہے جس طرح مغرب کے صنعتی دور میں سائنس کے پچھلے انکشافات سے فائدہ اٹھا کر اپنی مادی قوت اور تنظیم کے زور پر لوگوں کو لوٹا اور غلام بنایا اسی طرح زوال پذیر مشرق میں والیان ملک اور پیشوایان دین نے مذہب اور روحانیت کے نام سے قوت اور دولت حاصل کی۔ ترک شاعر عاکف کے یہ اشعار جو میں اس سے پہلے بھی نقل کر چکی ہوں مشرق کی حالت کا آئینہ ہیں۔

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی ہے آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا؟ میں نے اس سرے سے اس سرے تک

ویران بستیاں۔ بے سری قومیں۔ ٹوٹے پھوٹے پل بند نہریں ریستان سڑکیں دیکھیں۔ میں نے جھریاں پڑے چہرے۔ جھکی ہوئی کمریں۔ خالی دماغ بے حس دل الٹی عقلیں دیکھیں میں نے ظلم۔ غلامی خستہ حالی۔ ریاکاری قاتل تفرقے۔ ایذائیں طرح طرح کی بیماریاں۔ جلے ہوئے جنگل۔ ٹھنڈے چولہے۔ بنجر کھیت میلی صورتیں نکمے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ میں نے بے جماعت کے امام دیکھے۔ بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔

اگرچہ ہم یہاں مشرقی تمدنوں کی نسبت زیادہ نظر نہیں ڈال سکتے مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو یہ دعوے ہے کہ اس نے شروع میں زندگی کی مادی ضروریات کو پیش نظر رکھا تھا اور مادہ اور روح کے امتزاج کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ سر محمد اقبال فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر اور مکمل امتزاج اسلام نے کیا تھا مجھے بھی اس سے اتفاق ہے اسلام میں بندے اور خدا کے درمیان بلا واسطہ تعلق ہے۔ چنانچہ ابتدا میں نہ پادریوں کی قسم کا کوئی طبقہ تھا اور نہ دینیات کا کوئی پیچیدہ اور بے لوچ ضابطہ مادیت اور روحانیت جسم اور روح کا امتزاج اس مذہب میں اول سے آخر تک پایا جاتا ہے اس نے مسلمانوں کے واسطے ایک ایسا نظام معاشرت پیش کیا جس میں فرد اور جماعت دونوں کی فلاح مدنظر رکھی گئی ہے جسم کی صحت اور جسمانی تربیت۔ غذا کی احتیاط اعتدال۔ یہ اصول اسلام کے ارکان میں داخل ہیں۔ اس کا عدل و مساوات کا اصول ہر سوسائٹی کے لئے۔

مستحکم اور پائدار بننا چاہتی ہے ناگزیر ہے ۔

مسلمانوں کی پستی اور محکومی کو دو مختلف قسم کے نقاد دو مختلف اسباب کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔

۱۔ تصوّف کا سلسلہ جس کی وجہ سے روحانیت پر حد سے زیادہ زور دیا گیا اور وقت کی ترقی کی خاطر جسم سے غفلت برتی گئی

ہمارے اقبال ان لوگوں میں سے ہیں جو اسلام کے زوال کا سبب تصوّف کو قرار دیتے ہیں۔ ترکی کے اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی یہی خیال ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں درویشوں کے تمام سلسلے توڑ دیئے گئے ۔

۲۔ قانون شریعت کی سختی جس میں اتنا لوچ نہیں تھا کہ زمانے کے تغیرات سے مطابقت کر سکے اور جس کی وجہ سے اسلامی معاشرت میں جمود کی حالت پیدا ہو گئی ہے یہ خیال اسلامی ممالک میں سے صرف ترکی میں پایا جاتا ہے اور وہاں ایک بہت بڑا طبقہ اس کا مؤید ہے ۔ اسی وجہ سے ریاست اور مذہب میں تفریق کر دی گئی ہے ۔

یہ دونوں چیزیں صرف اسلام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ تین اسباب اور ہیں جنہیں کل مشرق کے زوال میں دخل ہے ۔

۱۔ پیشوایان دین نے (جن میں ہمارے ملّا بھی شامل ہیں) اپنے مذہبی جنون اور تاریک خیال کی وجہ سے اور اس لالچ میں کہ قوت ان کے ہاتھ سے نہ جانے

پائے۔ اور بادشاہوں نے اپنی نالائقی اور خودغرضی سے مشرق کو اسی حالت میں رکھا جو قرونِ وسطیٰ میں تھی چنانچہ بعض حصوں میں اب تک وہی حالت ہے۔

۲۔ مشرق کے تعلیم یافتہ طبقے نے کبھی مشرق اور مغرب کا مقابلہ تنقیدی نظر سے نہیں کیا جن لوگوں نے مغرب کا مطالعہ کیا ان کی معلومات صرف اس کے موجودہ صنعتی دور تک محدود رہی۔ اُن کی نظروں کو اُس کی قوت اور ظاہری شان وشوکت نے خیرہ کردیا۔ انھیں کبھی اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ تاریخ مغرب کے ان اہم ترزمانوں پر نظر ڈالتے جن میں مغربی سوسائٹی کو اپنی اندرونی معاشرتی اور اخلاقی تنظیم کی بدولت یہ استحکام اور پائداری نصیب ہوئی۔ نہ کبھی انھوں نے اتنی ہمت کی کہ خود اپنی تہذیب کی بنیادوں کا غور سے مطالعہ کریں۔ یا تو انھوں نے اس قدر قدامت پسندی سے کام لیا کہ تغیر اور اصلاح کی ضرورت ہی سے انکار کردیا یا یہ سطحی تنقیدی طرز اختیار کیا کہ مشرق کی تمام تاریخی قوتوں میں تجدید کا کوئی امکان نہ سمجھ کر انھیں مٹانے کے درپے ہوگئے۔ غرض مدت سے تک مشرق میں تعلیم یافتہ طبقہ دو فرقوں میں تقسیم رہا ایک جماعت تو مذہبی مجنونوں اور تاریک خیالوں کی تھی اور دوسری ان لوگوں کی جو یہ سمجھتے تھے کہ مغرب کے ظاہری تمدن کی اندھی تقلید مشرق کے مجہول اور بے حس لوگوں میں اندرونی تنظیم قوت اور استحکام پیدا کر سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق کے لوگ نہ صرف دو نئے نصب العین سے محروم رہے اور دوسری سلطنتوں کے ہاتھ ایک ایسا بیہ

-- بادشاہوں کے غلام بن گئے

۲۔ مشرق کے نام نہاد تعلیم یافتہ طبقے کی ان خامیوں کی وجہ سے مشرقی سوسائٹی کی نئی تنظیم کا کوئی فلسفہ یا نظام یا منصوبہ نہیں بنایا گیا۔

تعلیم یافتہ طبقے کی یہ بے حسی جس کی وجہ سے وہ اپنی اخلاقی ذمہ داری سے مجرمانہ غفلت برت رہا تھا انیسویں صدی میں دور ہو گئی اس زمانے میں مشرق کے ہر حصے میں کسی نہ کسی حد تک بیداری کے آثار نظر آنے لگے اس بیداری کی ابتدا ترکی سے ہوئی میں آپ کو ان لیکچروں میں عہد انقلاب کی کشمکش کا نقشہ دکھا چکی ہوں اس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ ترکی نے مادی زندگی میں مغربی تنظیم اور طریق عمل اختیار کر لیا ہے اس مسئلے کے حل کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے دوسری وہ ہے جس کی کوشش میں ہندوستان میں آپ لوگوں کو کرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں یعنی روحانیت اور مادیت کا امتزاج ممکن ہے کہ یہ صورت بہتر ہو اس کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے کیا اچھا ہو اگر مشرقی ملکوں کے ارباب علم یہ بتائیں کہ وہ ان مسائل کو کیوں کر حل کر رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جامعہ ملیہ وہ مرکز ہو گا جہاں مشرق کے ہر حصے کے علما آ کر اس امر پر روشنی ڈالیں گے کہ ان کے یہاں زندگی ارتقا کی کیا شکل اختیار کر رہی ہے میری دلی خواہش ہے کہ جامعہ مغرب کے علما کو بھی دعوت دے کہ وہ مغرب کی موجودہ جدوجہد اور مشرق و مغرب کے تعلقات کے متعلق اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں ممکن ہے کہ اس مبادلہ خیال کی بدولت مشرقی ملکوں میں مفاہمت کی کوئی بہتر صورت نکلے اور مشرق و مغرب میں اس کشمکش کی جگہ

اتحادِ عمل پیدا کرنے کی زیادہ موثر کوشش کی جا سکے۔

مشرق مغرب سے کب اور کیوں کر اتحادِ عمل کر سکتا ہے؟ اس وقت جب وہ اپنے آپ کو مغرب کا ہمسر سمجھے جب وہ اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہو۔ اتحادِ عمل کے لئے صرف یہی شرط نہیں کہ دونوں فریق مساوی درجے کے ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان میں ہر ایک کے پاس اتنی چیزیں ہوں جو دوسرے کے نزدیک قابلِ قدر ہیں اور جن میں مبادلہ ممکن ہے۔

ادھر مغرب نے ایک محدود طبقے ہی میں سہی مشرقی فلسفے کی برتری کو تسلیم کر کے آگے قدم بڑھایا ہے ادھر مشرق نے مادی زندگی کی تنظیم میں اپنی ناقابلیت اور مغرب کی قابلیت کا اعتراف کر کے پیش قدمی کی ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو ایک نوجوان مشرقی قوم کی ایک فرد نہایت ادب سے مشرق کی سب سے قدیم اور سب سے دانشمند قوم کے سامنے اپنے خیالات اس مسئلے کے متعلق عرض کرے۔

بادی النظر میں عموماً مشرق کو اور خصوصاً ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اندرونی تنظیم کی ہے۔ مشرق میں اکثر بڑے اولوالعزم فرماں روا پیدا ہوئے اور بڑے معرکے کر گئے۔ مگر ایسی قوموں کی مثالیں شاذ ہیں جن کی تنظیم اس طرح ہوئی ہو کہ وہ نازک موقعوں پر اپنی مدد آپ کر سکیں۔ بات یہ ہے کہ کسی قوم کی تنظیم حکومت کی طرف سے ممکن نہیں اسے خود اپنے اندر کی کوشش اپنی نشوونما کے مخصوص قوانین کے مطابق ہونی چاہیے۔ مشرق میں دو ایک ملکوں کے علاوہ قومیت کا کوئی معین اور محکم تصور موجود نہیں۔ [illegible]

خاص کر کے قوم پرستی کے بجائے قومیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قومیت سے میری مراد وہ جذبہ ہے جو ایک جماعت کی اندرونی قوتوں کو ابھارتی ہے اور ان میں افادی اور جمالی نقطۂ نظر سے ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور قوم پرستی سے مراد وہ جذبہ ہے جو خود اس جماعت کے اندر تفریق اور انتشار پیدا کرتا ہے اور دوسری قوموں سے تصادم کا باعث ہوتا ہے۔

قومیت کے بنیادی عناصر نسل، مذہب اور زبان ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں ان تینوں چیزوں کا کیا حال ہے۔

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو نسل کی اہمیت کا نظریہ یہاں باطل ہو جاتا ہے نسل کی تفریق اگر ہے تو تہذیب کے لحاظ سے ہے خون کے لحاظ سے نہیں ہے بہت سے مسلمان ہندوؤں کی نسل ہیں بہت سے ہندو ایسے ہیں جنھوں نے باہر سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا اور جو مذہب یہاں جاری تھا اُسے اختیار کر لیا۔ یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ اسلام (جو ہندوستان کا ایک نہایت اہم مذہب اور تمدن ہے) نسل کی تفریق کا مخالف ہے۔ آریہ سماج زور لگا رہی ہے کہ ذاتوں کی تقسیم جو ابتدا میں نسل کی حفاظت کے لئے کی گئی تھی توڑ دے اور مہاتما گاندھی اس سے زیادہ وسیع اصولوں کے مطابق اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مذہب تمام دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں ایک بہت بڑی حقیقی قوت ہے اس لئے بہت اچھا ہوتا اگر آپ لوگوں کی قومیت کی بنیاد مذہبی اتحاد پر ہوتی مگر یہ ناممکن ہے یہی نہیں کہ ملک میں متعدد مذاہب ہیں بلکہ ہر مذہب میں خدا جانے کتنے فرقے ہیں ایک مشترک مذہب رائج کرنے کی کوشش جیسی اکبر نے کی تھی بالکل فضول ہے کیوں کہ کوئی مذہب جبراً رائج نہیں کیا

جا سکتا بہتر یہ ہے کہ مذہب کو نہ چھیڑا جائے مگر تمام مذاہب کے درمیان ایک رشتہ اتحاد
پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسے مذہب کا جز بنایا جا سکتا ہے حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ کے
مسلمان پہلے ہی سے قائل ہیں ممکن ہے کہ ہندوؤں کے یہاں بھی اس قسم کا عقیدہ موجود ہو۔
سب مذاہب یہ کر سکتے ہیں کہ قومی اتحاد کو ایک عقیدہ بنا لیں اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دیں

ظاہر ہے کہ ایک ایسی قوم میں جو مختلف تہذیبوں کا مجموعہ ہو ہر جماعت کو اس کا حق ہونا
چاہئے کہ اپنی تہذیب کو قائم رکھے اور اسے ترقی دے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک مشترک زبان
کا ہونا نہایت ضروری ہے خواہ ایک ملک میں سیکڑوں زبانیں ہوں مگر ان میں سے ایک زبان
ایسی ہونی چاہیئے کہ تمام ملک کے مدارس میں رائج ہو اور ہر بچے کو لازمی طور پر پڑھائی جائے۔

فرض کیجئے کہ ہندوستان میں یہ سب مسئلے حل ہو جائیں تو کیا ہندوستانی ایک قوم بن
جائیں گے؟ ہرگز نہیں ہندوستان کے غریبوں کا معیار زندگی مغربی ممالک کے [illegible] سے
بھی بدرجہا پست ہے جو غریب [illegible] میں رہتے ہیں [illegible] ہندوستان کے [illegible]
کی جھونپڑیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد کہہ [illegible]
رہنے والوں کی تعداد [illegible] ہندوستان کے [illegible]
کی حالت بھی ہندوستان میں اور دوسرے مشرقی ممالک میں [illegible]
نتیجہ ہے کہ اگرچہ [illegible] آدمی مذہب کا [illegible]
مگر قومیت کے لئے مجرد تصورات [illegible]
[illegible] یہ سچ ہے کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ نہیں ہے مگر [illegible]

زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور زندگی کی ضروریات میں پیٹ کی روٹی کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی داخل ہیں ایک خاص معیار زندگی سے نیچے اُتر کر انسان کوٹھو کا بیل بن کر رہ جاتا ہے وہ زندگی کا چکر کسی نہ کسی طرح اس امید پر کاٹتا رہتا ہے کہ دوسری دنیا میں اُسے آرام ملے گا ایسے شخص کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ کوئی خاص سرزمین اس کا وطن ہے اس کا وطن تو وہی ہے جہاں اس کو آرام ملے جب تاریخی مادیت کے پیرو مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ مشرق میں مذہب کا ڈھکوسلا اسی لئے ایجاد کیا گیا تھا کہ غریب اپنے حال پر قانع رہیں تو گو مجھے اس سے پوری طرح اتفاق نہیں مگر میں ان کی اس منطق کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

چونکہ مشرقی ملکوں میں شاید جاپان اس سے مستثنیٰ ہو نوے فیصدی آبادی کسانوں کی ہے اس لئے مشرق کو اپنی اندرونی تنظیم کے لئے فوراً گاؤں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ مشرق کی معاشرتی معاشی اور اخلاقی اصلاح و ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ دیہات کی حالت سدھاری جائے آپ لوگوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ مہاتما گاندھی نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ شروع کر دی ہے۔

مہاتما گاندھی کی یہ کوشش نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ کل مشرق کے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایک طرف تو مشرق کے کسان کی معاشی اور اخلاقی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور دوسری طرف مشین کی صنعت کا جو تیزی سے ہندوستان میں پھیل رہی ہے مقابلہ کر رہے ہیں وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے یا نہیں ہوں گے یہ ایک جداگانہ سوال ہے اس وقت بھی دیکھا جائے تو انھیں تھوڑے ہی دنوں میں خاصی کامیابی ہو چکی ہے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ان جاہل کسانوں میں مشین کی صنعت تیزی سے پھیل گئی تو وہ مغربی سرمایہ داروں کی

غلامی کی زنجیروں میں اور بھی زیادہ جکڑ جائیں گے وہ انھیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ آزادی کی زندگی بسر کریں ایسی ضرورت کی چیزیں خود پیدا کریں اور کسی دوسرے کے محتاج نہ رہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے کسان ہندوستانی قوم کے بے زبان غلام نہ رہیں بلکہ اس کا ایک اہم عنصر بن جائیں۔ اس کے علاوہ وہ ان کی اصلاح کے مسئلے کو مجموعی طور پر حل کرنا چاہتے ہیں ان کا دل سے یہ عقیدہ ہے کہ جسم اور روح کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھنا چاہیے[1]۔ ان میں سے ایک کی اصلاح

[1] ہم یہاں انگلستان کے مشہور ناول نویس آلڈس ہکسلے کے ڈو لچسپ اقوال نقل کرتے ہیں اس پر مشرق و مغرب کی سیاحت کے عجیب متضاد اثرات پڑے تھے جب وہ ہندوستان آیا تو اس نے دیکھا کہ یہاں روحانی زندگی پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اس کی ضد میں وہ مادیت کو اور بھی زیادہ اہمیت دینے لگا چنانچہ اس نے اپنے سفر نامے میں جس کا نام "مسخرا پائلٹ" ہے لکھا ہے "مغربی تمدن میں جو عیب ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو واقعی دنیا سے کافی دلچسپی نہیں یعنی ہم میں اسی مادیت نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے۔"

مگر جب وہ امریکہ گیا اور اس نے مغربی تمدن کے انتہائی نتائج دیکھے تو اس نے فوراً اپنی رائے بدل دی چنانچہ وہ اس کتاب میں کہتا ہے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس سفر میں بہت کچھ کھویا اس سے مراد لطریات وعقائد ہیں مگر اس کے بدلے مجھے دو نئے عقیدے ہاتھ آئے ایک تو یہ کہ دنیا میں ہر طرح کے لوگوں کی جو ضرورت ہے دوسرے یہ کہ وہ روحانی قدریں جنھیں دنیا تسلیم کر چکی ہے اصولاً درست ہیں اور انھیں ضرور قائم رکھنا چاہیئے۔

بغیر دوسرے کی اصلاح کے ممکن نہیں جب ان کی اصلاح ہوگی تو ساتھ ہی ساتھ ہوگی اور دونوں کے اتحاد عمل سے ہوگی مہاتما گاندھی کی ان کوششوں کو دیکھ کر مجھے صوفیوں کی وہ جماعت (اخیلر) یاد آتی ہے جس نے تیرھویں صدی میں اناطولیہ میں ترکی کی معاشی اور اخلاقی تنظیم کی تھی۔

تمام ہندو مردوں اور عورتوں کو اس کام میں اُن کی تائید اور تقلید کرنی چاہیئے اس لئے کہ سارے ہندوستان میں وہی ایک شخص ہیں جو ہندو مذہب کو ان توہمات اور تخریبی عناصر سے جو اس میں داخل ہوگئے ہیں پاک کرسکتے ہیں اور اس کے بہترین عناصر سے کام لے سکتے ہیں کل مسلمانوں کو بھی ان کی مدد کرنی چاہیئے کیوں کہ جو اصلاح وہ کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیاد اسلام کے ابدی اصولوں پر قائم ہے میری ناچیز رائے میں اُن کی ذات جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے ان کے یہاں جسم کی صفائی اخلاق کی پاکیزگی۔ ضبط نفس۔ محبت اور اخوت محنت اور مشقت۔ تعلیم۔ سچائی امن غرض سب ہی کچھ موجود ہے۔

مشرق اور مغرب دونوں کو ان کی تعلیم اور ان کے عمل کا مطالعہ بہت غور سے کرنا چاہیئے اس لئے کہ وہ ایک ایسا طریقہ پیش کر رہے ہیں جس میں نہ صرف مشرق کی بھلائی ہے بلکہ مغرب کو بھی ایک آزاد۔ قومی۔ با اخلاق اور پُر امن مشرق سے اتحاد عمل کرکے نجات حاصل

ہو سکتی ہے۔ میں اپنی تقریر کو ان الفاظ پر ختم کرتی ہوں: "مستقبل کی کنجی اس قوم کے ہاتھ میں ہے جو مادیت اور روحانیت کا امتزاج اس طرح کرے گی کہ جہاں تک ممکن ہے دونوں کے اجزا مساوی ہوں"۔



اخیلر کے متعلق چند ضروری باتیں

ابھی یہ کتاب زیر طبع تھی کہ مصنف نے رسالہ جامعہ کے لئے "اخیلر کے حلقہ" پر ایک مضمون ارسال فرمایا اس مضمون میں اس حلقہ کے بہت سے نئے حالات اور تازہ ترین معلومات درج تھیں اس لئے اس کے متعلق صفحہ ۱۶۱ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں چند ترمیمیں اور اضافے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ "اخی" کی اصطلاح کا اس عربی لفظ سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے معنی بھائی کے ہیں بلکہ اس کا ماخذ ترکی زبان ہے ابتدائی زمانے کے اخیار جنھیں عام طور پر فتوت کہتے تھے مجاہدین کا ایک حلقہ تھا سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا خود عثمان اعظم اخی تھے قدیم بنی چری بھی اخی یا کم از کم (سپاہی) تھے۔ یعنی سواروں کی وہ فوج بھی جو زمیندار اشراف پر مشتمل تھی اخی تھی۔ اس حلقہ کا نشان ایک خاص قسم کی شلوار تھی۔

سلطنت عثمانیہ نے جب اخیلر کے جنگجو عنصر کو اپنے میں جذب کرلیا اور جب "خونی خراج" کا طریقہ شروع ہوا تو وہ اخیلر کی سیاسی قوت کو شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگی لیکن جہاں کہیں مرکزی طاقت کمزور ہی مثلاً انگورہ اور کرشہر میں وہاں اخیر با اثر و با رسوخ رہے اور برسر اقتدار رہے چودھویں صدی کے وسط میں جب عثمانیوں نے انگورہ فتح کرلیا تو رفتہ رفتہ اناطولیہ میں اخیلر کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر کچھ اقتصادی

حشیت سے وہ اٹھارویں صدی تک حاوی رہے۔ اس کے بعد اُن کی تمام قوتیں
ختم ہوگئیں ان کا وجود جنگ عظیم کے بعد تک باقی رہا۔

(ناشر)